قتلِ مسلم

اسباب ووجوہات، احکام ومسائل

مؤلف :

مفتی عبید الرحمان، مردان

مکتبہ دار التقویٰ، مردان

نام کتاب:۔۔۔۔۔۔ قتل مسلم،اسباب ووجوہات،احکام ومسائل

مصنف:۔۔۔۔۔۔۔۔مفتی عبید الرحمان صاحب،مردان

صفحات:۔۔۔۔۔۔۔۔۱۲۱صفحات

اشاعت:۔۔۔۔۔۔۔۔۱۱رمضان ۱۴۴۴ھ

ناشر:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مکتبہ دارالتقویٰ،مردان۔

فون نمبر/وٹس ایپ:

03009326101

03143017364

ملنے کا پتہ:

دارالافتاء جامعہ محمدیہ مایار،مردان

فہرست مضامین

باب اول: 7

قتل مسلم کی شناعت اور اس کی ناجائز صورتیں 7

قتل انسان؛ایک عظیم جرم وگناہ.. 7

خون انسان کا اصل حکم.. 11

حدیثِ قتال سے استدلال کا جواب.. 18

جان ومال کے معصوم ہونے کی بنیاد.. 20

قتل بجذبہ شفقت.. 23

قتل بجذبہ شفقت کی ایک واضح نظیر.. 25

جذبہ شفقت کے تحت مریض کا علاج چھوڑنا.. 27

ایک سرسری اعتراض اوراس کا جواب.. 28

ترکِ علاج کا حکم.. 29

مختلف قسم کے علاج اوران کا حکم.. 32

باب دوم: 33

قتل مسلم واجب ہونے کی صورتیں 33

تین صورتوں میں قتل کرناضروری ہے.. 33

پہلی صورت: قصاص.. 34

دوسری صورت: سنگسار کرنا.. 34

تیسری صورت: ارتداد.. 34

تین صورتوں میں انحصار کیوں؟.. 37

انحصار کی پہلی توجیہ.. 38

امام نووی رحمہ اللہ کی تین توجیہات 40

ڈاکہ ڈالنے والے کو قتل کرنا 42

باب سوم: 45

قتلِ مسلم مباح ہونے کی صورتیں 45

تعزیری قتل کے متعلق چند احکام 45

تعزیر کون دے؟ 45

کس جرم پر تعزیری سزا دی جائے؟ 48

قرائن کی بنیاد پر تعزیر 48

قتل اور تعزیر کے دیگر مختلف درجات 50

تعزیری قتل کی دو صورتیں 51

جرمِ تعزیری کو معاف کرنا 52

تعزیر سے متعلق باتوں کا خلاصہ 55

تعزیری کی بناء پر قتل کی بعض صورتیں 55

پہلی صورت: چور کو قتل کرنا 55

چور مشہور ہونے اور دس درہم چوری کرنے کی قید 58

دوسری اور تیسری صورت: 60

جان وعزت پر حملہ آور کو قتل کرنا 60

عزت کی بچاؤ کے لئے خودکشی کرنا 63

مسئلہ سے متعلق چند فقہی عبارات 63

عبارات سے حاصل ہونے والے فقہی فوائد 70

بدکاری پر جبر کے وقت کیا کیا جائے؟ 71

ایک مفید اشکال وجواب 73
تحفظ عصمت کے لئے جان کی بازی کھیلنا 73
ایک مفید فقہی نظیر: تین طلاق کے باوجود بیوی روکے رکھنا 74
چند عفیف مسلمان عورتوں کے واقعات 75
عباسی خلیفہ کی بیوی اور ہلاکو خان 75
ان جیسے واقعات کی شرعی حیثیت 77
چوتھی صورت: غیرت کے نام پر قتل کرنا 78
زانی کا قتل کرنا 79
زنا کرنے کے بعد قتل کرنا 82
عوام کو حقِ تعزیر نہ دینے پر اشکال 82
بعض اہل علم کا موقف 84
عوام کو اختیار دینے کے نقصانات 85
پانچویں صورت: جاسوس کا حکم 89
جاسوس کی مختلف صورتیں 89
مسلمان جاسوس کا حکم اور مذاہب اربعہ 90
قدیم وجدید جاسوس میں فرق 98
چھٹی صورت: دشمنِ اسلام قوت کے ساتھ دینا 102
مولانا نور محمد صاحب کی تحقیق 106
ضروری تنبیہ 107
ساتویں صورت: مفسد وعلانیہ ظالم کو قتل کرنا 108
آٹھویں صورت: فدائی حملہ کرنے کا شرعی حکم 113

امام محمدؒ کی ذکر کردہ تفصیل...116
مصادر و مراجع..120

باب اول:

قتل مسلم کی شناعت اوراس کی ناجائز صورتیں

ناحق کسی انسان جان کا قتل کرناان گناہوں اور جرائم میں سے ایک ہے جس کے جرم عظیم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، نقل کے لحاظ سے کسی مذہب میں اس کی اجازت ہے نہ ہی عقل کے لحاظ سے کوئی عقل سلیم رکھنے والا شخص اس کی اجازت دے سکتا ہے،اخلاق وتمدن کے لحاظ سے بھی یہ نہایت عظیم جرم کی بات ہے، دنیا کا کوئی قانون ومذہب ہمیں معلوم نہیں ہے جو ناحق قتل انسان کو جائز قرار دیتی ہو نہ ہی کسی عقل سلیم کے ہاں اس کی کوئی گنجائش ملتی ہے،اس لئے اس سے متعلق کچھ زیادہ تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں ہےالبتہ ایک دو آیات اور ایک دو احادیث ذکر کرنےپر اکتفاء کیاجائے گا،اس کے بعد ان صورتوں کی تفصیل ذکر کی جائے گی جہاں حد یاتعزیر کے طور پر قتل کرنا جائز یاضروری ہوتاہے اور ساتھ اس کے حدود وقیود ذکر کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔

قتل انسان؛ایک عظیم جرم وگناہ

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں انسانی جان کے قتل کو عظیم جرم،نہایت مذموم اور کبیرہ گناہوں کے سر فہرست شمار فرمایا گیاہے۔قرآن کریم میں ہے؛

{وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا }[1]

ترجمہ: "اور جو شخص کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ تعالی کا غضب اور لعنت ہے اور اللہ تعالی نے ایسے شخص کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

اس آیت مبارکہ میں کسی مسلمان کے ناحق قتل کرنے پر درج ذیل سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے؛

۱؛ جہنم میں جانا۔ ۲: جہنم میں ہمیشہ رہنا۔ ۳: اللہ تعالیٰ کے غضب کا مورد بننا۔ ۴: اللہ تعالیٰ کی لعنت کا اترنا۔ ۵: اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ان پانچوں سزاؤں میں سے ہر چیز بجائے خود بہت ہی نقصان وخسارہ کا باعث ہے، ناحق قتل کرنے والے شخص کو ان سب چیزوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس آیت کریمہ کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ ناحق قتل کا مجرم ان سب بدلوں سے ضرور حصہ پائے گا۔

"صحیح بخاری" کی روایت ہے؛

عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «اجتنبوا السبع الموبقات»، قالوا: يا رسول الله وما هن؟ قال: «الشرك بالله، والسحر، وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق، وأكل الربا، وأكل مال اليتيم،

[1] [النساء: ٩٣]

والتـولي يـوم الزحـف، وقـذف المحصـنات المؤمنـات الغافلات»[1]

ترجمہ: "حضرت ابوھریرہؓ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل ہے کہ: " ہلاک کرنے والے سات(۷) گناہوں سے اپنے آپ کو بچاؤں، صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول وہ کیا ہیں؟آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک بنانا، جادو کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، سودی معاملہ کرنا، یتیم کا مال کھانا، جہاد کے میدان سے بھاگنا، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا"۔

اس روایت میں جن سات چیزوں کو مہلک قرار دیا گیاہے،ان میں سے ایک "قتلِ نفس"کو بھی شمار فرمایا گیاہے،ان میں سے پہلی مہلک چیز تواللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے،دوسری چیز سحر کرنا ہے،شرک کا حکم تو ظاہر ہے کہ انسان کو دائرہ دین واسلام سے خارج کردیتی ہے اور سحر بھی عام طور پر شرک یا کفر کا موجب بنتا ہے،ان دونوں کے علاوہ جن پانچ چیزوں کواس روایت میں گنوایا گیاہے،وہ ایسے ہیں جو فی نفسہ موجب کفر نہیں ہیں اوران میں سے سب سے پہلے قتل کاذکر کیا گیاہے جس سے اس گناہ کی سنگینی اور حد درجہ مذمت کااندازہ لگایاجاسکتاہے، گویا موجب کفر امور کے بعد سب سے زیادہ قابل مذمت اور سنگینی کاموجب یہی اقدام کرنا ہے۔" صحیح بخاری"ہی میں ایک اور جگہ روایت ہے:

---

[1] صحيح البخاري،ج٤ص١٠.

عن أنس بن مالك، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: " أكبر الكبائر: الإشراك بالله، وقتل النفس، وعقوق الوالدين، وقول الزور، - أو قال: وشهادة الزور - "[1]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کبیرہ گناہوں میں سے یہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، کسی کو ناحق قتل کیا جائے، والدین کی نافرمانی کی جائے، اور جھوٹی گواہی دی جائے"۔

"سنن نسائی" کی روایت ہے؛

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَزَوَالُ الدُّنْيَا أَهْوَنُ عِنْدَ اللَّهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ»[2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓو سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل ہے کہ " کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پوری کائنات کے ختم ہو جانے کے مقابلے میں بھی کسی مسلمان کا ناحق قتل کرنا زیادہ جرم ہے"۔

اس روایت سے ناحق قتل کی غیر معمولی سنگینی ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ اقدام عظیم جرم اور سخت گناہ و ناراضگی کی بات ہے جس کی بنسبت پوری دنیا کا ختم ہونا بھی کم ہے، دنیا سے صرف زمین ہی مراد نہیں ہے بلکہ پوری کائنات اس کے عموم میں داخل ہے تو

---

[1] صحيح البخاري،ج٩ص ٤-

[2] سنن النسائي،ج٧ص ٨٢-

پوری کائنات کا برہم ہو جانااس قدر ناراضگی کا موجب نہیں ہے جس قدر ناراضگی اس اقدام سے پیدا ہوتی ہے۔

خون انسان کا اصل حکم

انسان میں اصل یہ ہے کہ وہ معصوم ہو یعنیٰ اس کی جان محفوظ ہو اور اس سے تعرض کرنا، خون بہانا حرام و ممنوع ہو یا اصل کے لحاظ سے اس کا خون مباح ہے جب تک کہ اسلام قبول کر کے اس کو عصمت و حفاظت فراہم نہ کرے؟ یعنیٰ انسان میں اصل یہ ہے کہ وہ معصوم الدم ہو یا مباح الدم ہونا اصل ہے؟ اس میں دونوں ہی پہلو ہیں، بعض روایات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مباح الدم ہونا اصل ہے اور جب تک وہ توحید و رسالت کا اقرار نہ کرے تب تک اس کا خون معصوم نہیں ہوتا، مثلاً صحیح بخاری کی روایت ہے:

حدثنا أبو اليمان، أخبرنا شعيب، عن الزهري، حدثنا سعيد بن المسيب، أن أبا هريرة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا: لا إله إلا الله، فمن قال: لا إله إلا الله، فقد عصم مني نفسه وماله، إلا بحقه وحسابه على الله " رواه عمر، وابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم.[1]

---

[1] صحيح البخاري،كتاب الجهاد والسير،باب دعاء النبي صلى الله عليه وسلم الناس إلى الإسلام والنبوة،رقم الحديث:٢٩٤٦.

ترجمہ:"حضرت ابو ھریرہؓ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل ہے کہ :"کہ مجھے تمام لوگوں (کفار) سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک وہ کلمہ توحید کا اقرار کرلے، لہذا جس نے بھی کلمہ توحید کا اقرار کرلیا تو تحقیق اس کی جان اور مال محفوظ ہوگیا مگر اسلام کے کسی حق کی وجہ سے (پھر اس کا خون محفوظ نہیں ہوگا)، اور باقی ان کا معاملہ اللہ تعالی کے ساتھ ہے (اگر وہ زبان سے بظاہر کلمہ توحید کا اقرار کرتا ہے اور دل میں نفاق ہے تو قیامت میں اللہ کے ہاں اس کے ساتھ نیت کے مطابق فیصلہ ہوگا)"۔

یہ اور اس کے ہم معنیٰ دیگر متعدد روایات کے ظاہری الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ تمام لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ اسلام قبول نہ کریں، دینِ اسلام قبول کرنے کے بعد ہی ان کی جان ومال محفوظ ہوسکتی ہے، اس سے بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانیت میں اصل یہی ہے کہ وہ مباح الدم ہو جب تک کہ دین حق قبول کرکے اپنے آپ کو محفوظ و معصوم نہ ٹھہرائے۔

یہ تو اس مسئلے کا ایک پہلو ہے لیکن شریعت مطہرہ کے متعدد ضوابط اور کئی احکام ومسائل سے بڑی وضاحت کے ساتھ اس کا دوسرا پہلو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اور انسانیت میں اصل یہی ہے کہ اس کا خون معصوم و محفوظ ہے جب تک کہ وہ کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کربیٹھے جو شریعت کی نگاہ میں کسی کے خون مباح ہونے کا سبب بنتا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن وسنت میں انسان کے اکرام واحترام کے کئی نصوص موجود ہیں جس میں انسان کو دیگر تمام چرندوپرند اور دیگر مخلوقات پر اہمیت وفضیلت دی گئی ہے اور یہ بات بھی ارشاد فرمائی گئی ہے کہ بروبحر اور چرندوپرند وغیرہ کائنات کی چیزوں کو اسی حضرت کی خدمت وانتفاع کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

مثلاً جانور، جس کی حیثیت انسان کے خادم ہونے کی ہے، اس میں شریعت مبارکہ کی تعلیم یہی ہے کہ بلاوجہ کسی جانور کو نہ مارا جائے، چنانچہ "در مختار" میں ہے:

لا يحل قتل ما لا يؤذي، ولذا قالوا لم يحل قتل الكلب الأهلي إذا لم يؤذ والأمر بقتل الكلاب منسوخ كما في الفتح: أي إذا لم تضر.[1]

ترجمہ: "کسی ایسے جانور کو قتل کرنا جائز نہیں جو تکلیف دہ نہ ہو، اسی وجہ سے فقہاء کرام فرماتے ہیں: پالتوں کتے کو قتل کرنا جائز نہیں جب کہ وہ تکلیف دہ نہ ہو، اور کتوں کو قتل کرنے کا حکم اب منسوخ ہو چکا ہے جیسا کہ "فتح القدیر" میں ہے"۔

اب جب خادم مخلوق کے ساتھ دین اسلام کا یہی رویہ اور عادلانہ برتاؤ ہے تو حضرت انسان کو کیونکر مباح الدم قرار دے سکتا ہے! البتہ اگر اکرام و احترام کے بعد بھی کوئی انسان اپنی مقصد اصلی کو چھوڑ کر خدا کے باغی بننے کی جسارت کرتا ہے تو بلا شبہ وہ دیگر تمام جانوروں کی بنسبت بڑا ناکام و بے فائدہ ثابت ہو جاتا ہے اس لئے وہ اسی بات کا مستحق ہے کہ اس کو مزید "مخدومیت" کا موقع نہ دیا جائے اور اس کا صفایا کر دیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ خود انسانیت میں اصل یہ ہے کہ وہ مباح الدم ہو بلکہ یہی کہنا انسب ہے کہ اصل انسانیت کے لحاظ سے تو یہ شخص اور اس کی جان و خون دیگر تمام انسانوں کی طرح معصوم و محترم تھی لیکن دینِ اسلام اور اپنے خالق کی جرمِ بغاوت

---

[1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، باب الجنايات في الحج، ج٢ ص٥٧٠.

کاارتکاب کر کے وہ اپنی اس حیثیت کو کھو بیٹھااور مباح الدم قرار پایا۔یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو دینِ حق کا پیغام نہیں پہنچاان کے ساتھ قتل وقتال کرنے سے پہلے دعوت دینا ضروری ہےاور دعوت دئے بغیر قتل کرناجائز نہیں ہے۔

علامہ فخر الدین زیلعی رحمہ اللہ ،حضرات شوافع کےایک استدلال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ولا نسلم أن أصل العصمة بالإسلام بـل بكونـه آدميـا لأنه خلق لإقامة الدين ولا يتمكن من ذلك إلا بعصـمة نفسه بأن لا يتعرض له أحد وإباحة قتله عارض بسـبب إفساده بالقتـال ألا تـرى أن مـن لا يقاتـل مـن الكفـار كالذمي وذراري الحربي لا يجـوز قتلـه لعـدم الإفسـاد، والمقومة تحصل بالإحراز بالدار ألا ترى أن الـذمي مـع كفـره يتقـوم بـالإحراز ولا تـأثير للإسـلام في تحصـيل العصمة لأن الدين ما وضع لاكتساب الدنيا وإنما وضع لاكتساب الآخرة وإذا كانت النفس معصومة بالآدميـة فالمال يتبعها ليتمكن من تحمل أعباء التكاليف وإن خلق عرضة في الأصل لأنه لا يقدر إلا بـه فيكـون معصـوما بعصمته وأما العصمة المقومة فالأصل فيها للأموال لأن التقوم يـؤذن بجـبر الفائـت بالتماثـل فيسـد مسـده ولا يتصور ذلك في الـنفس حقيقـة بخـلاف المـال فكانـت

النفوس تابعة للأموال فيها ثم العصمة المقومة في الأموال لا تكون إلا بالإحراز بالدار مع كونه أصلا فيها ففي النفس أولى لأنها تبع فيها وليس فيما رواه ما يدل على ما قال لأنهم عصموا أنفسهم بترك القتال ولهذا لم يعصموا به بغير تركه ونظيره أداء الجزية يعصم الكافر به نفسه على اعتبار أنه يترك الإفساد عند أدائها.[1]

ترجمہ: "اس بات کو ہم نہیں مانتے کہ انسان کا محفوظ الدم ہونا مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے بلکہ انسانیت کی وجہ سے ہے کیونکہ انسان کی پیدائش دین کو قائم رکھنے کے لئے ہوئی ہے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ انسان کی اپنی جان محفوظ ہو بایں طور کے اس سے تعرض نہ کیا جائے، اور جہاں تک انسان کو قصاصاً قتل کرنا مباح ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل قتل کے ذریعہ سے معاشرے میں فساد پھیلانے کا سبب بنا ہے (تو بطور سزا اس کا خون مباح ہو گیا)، چنانچہ کفار میں سے جو ذمی اور حربی کی نابالغ اولاد مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں شرکت نہ کریں تو جہاد کے دوران ان کا قتل بھی جائز نہیں، کیونکہ یہ فساد پیدا کرنے میں واسطہ نہیں بنے، اور نفس کا متقوم ہونا دار الاسلام میں حفاظت حاصل کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے، چنانچہ دار الاسلام میں حفاظت حاصل کرنے کی وجہ سے ذمی کی جان کفر کے باوجود متقوم ہے، اور خون کے محفوظ ہونے میں اسلام کا کوئی دخل نہیں؛ کیونکہ دین اسلام دینا کمانے کے لئے نہیں بھیجا گیا بلکہ آخرت کمانے کے لئے بھیجا گیا ہے، اور جب یہ بات ثابت ہو گئی انسان کا محفوظ الدم ہونا

---

[1] تبيين الحقائق، كتاب الجهاد والسير، باب المستأمن، ج٣ ص٢٦٨.

انسانیت کی وجہ سے ہے تو مال بھی نفس کے تابع ہوگا، تا کہ انسان کو اسلام کے جس احکام کا پابند بنایا گیا ہے اس پر انسان کو قدرت حاصل ہو، بر خلاف مال کہ اس کو اصل میں مختلف طریقوں سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان اس پر قادر نہیں ہو سکتا تو انسان کی عصمت کی وجہ سے مال بھی معصوم ہوگا، اور جہاں تک عصمت متقومہ ہے تو اس میں اصل مال ہے کیونکہ کسی چیز کی قیمت مقرر کرنا اسی طرح چیز کی ساتھ اس فوت شدہ چیز کی تلافی کی خبر دیتا ہے، اور یہ قیمت اس فوت شدہ چیز کے قائم مقام ہو گی، اور اس کا تصور جان و نفس میں حقیقۃ نہیں کیا جا سکتا بر خلاف مال کے، لہذا اس میں نفس مال کے تابع ہوگا، پھر عصمت مقومہ کی ضمان جب مال سے دی جائے تو یہ اس صورت میں ہوگا کہ وہ نفس دارالاسلام میں محفوظ ہو باوجود یہ کہ عصمت مقومہ میں اصل مال ہی ہے، تو نفس میں بطریق اولی اس کا لحاظ رکھا جائے گا، اور امام شافعی رحمہ اللہ نے جو روایت نقل کی ہے وہ ان کی دلیل نہیں بنتی کیونکہ ان کی جانیں قتال کو چھوڑنے کی وجہ سے محفوظ ہو گئیں، اسی وجہ سے اگر وہ قتال کریں گے تو ان کی جانیں معصوم نہیں ہو گی، اور اس کی مثال جزیہ کے ذریعہ کافر شخص کا اپنی جان کو محفوظ کرنا ہے کہ جزیہ کے ادائیگی اس نے فساد پیدا کرنے کو چھوڑ دیا"۔

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ کے ایک استدلال کے جواب کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

ولأن العصمة المؤثمة بالآدمية لأن الآدمي خلق متحملا أعباء التكليف والقيام بها بحرمة التعرض والأموال تابعة لها أما المقومة فالأصل فيها الأموال لأن

التقـوم يـؤذن بجـبر الفائـت وذلـك في الأمـوال دون النفوس لأن من شرطه التماثل وهو في المال دون النفس فكانت النفوس تابعة ثـم العصـمة المقومـة في الأمـوال بالإحراز بالدار لأن العزة بالمنعة فكذلك في النفوس إلا أن الشرع أسقط اعتبار منعة الكفرة لما أنه أوجب إبطالها والمرتـد والمسـتأمن في دارنـا مـن أهـل دارهـم حكـما لقصدهما الانتقال إليها.[۱]

ترجمہ: "عصمۃ مؤثمہ انسانیت کی وجہ سے ہے کیونکہ انسان کی پیدائش اسلام کے احکام کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے ہوئی ہے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ انسان کی جان سے تعرض (قتل کرنا) حرام ہو اور اموال بھی نفس کے تابع ہے، اور جہاں تک عصمت مقومہ ہے تو اس میں اصل مال ہی ہے کیونکہ کسی چیز کی قیمت مقرر کرنا فوت شدہ چیز کی تلافی کی خبر دیتا ہے، اور یہ اموال میں تو ہو سکتا ہے نہ کہ نفوس میں کیونکہ اس کے شرائط میں سے برابری بھی ہے، اور یہ مماثلت اموال میں ہو سکتی ہے نفوس میں نہیں، تو اس میں نفوس مال کے تابع ہونگے، پھر عصمت مقومہ کی ضمان جب مال سے دی جائے تو یہ تب ہی ہو گا کہ وہ نفس دارالاسلام میں محفوظ ہو کیونکہ عزت تب حاصل ہو گی کہ مسلمانوں کی طرف سے قوت اور طاقت شامل ہو اور قیاس کے مطابق نفوس میں ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن شریعت نے کفار کی قوت اور طاقت کو ساقط اور باطل کر دیا ہے، اور مرتد و مستامن جو ہمارے مسلمانوں کے ملک میں ہے وہ

---

[۱] الهداية في شرح بداية المبتدي ،كتاب الجهاد والسير،باب المستأمن،ج۲ص۳۹۷.

بھی حکما حربی ہے کیونکہ یہ دو(۲) نوں دارالحرب واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں"۔

حدیثِ قتال سے استدلال کا جواب

تمام نصوص کو مد نظر رکھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ کی درج بالا روایت میں، جہاں لوگوں سے قتال کرنے کا حکم مذکور ہے یہاں تک کہ وہ توحید ورسالت کا اقرار کرکے مسلمان نہ ہوں، "ناس" سے تمام انسانیت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے وہی لوگ مراد ہیں جن تک دینِ اسلام کی دعوت اچھی طرح پہنچ چکی ہو اور اہلیت اور مکلف ہونے کے باوجود وہ بلاوجہ ایمان قبول کرتے ہوں نہ ہی ذمی بن کر اسلامی حکومت کے تحت رعایا بن کر زندگی گزارنا برداشت کرتے ہوں، ایسے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، البتہ چونکہ خود قتال مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ ان کو راہ راست پر لانا مطلوب ہے اس لئے اگر قتال سے کسی کم تر درجہ کے اقدام کرنے سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہے تو قتال کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور ایسی صورت میں اسی کم تر درجہ والے اقدام کو اختیار کر لینا چاہئے۔

"الاختیار" کی درجِ ذیل جزئیہ سے استیناس کیا جا سکتا ہے:

قال: (ولا يملكون علينا مكاتبينا ومدبرينا وأمهات أولادنا وأحرارنا) لأن الأصل في الآدمي الحرية، والحرية مقتضى قوله تعالى: {ولقد كرمنا بني آدم} إلا

أن الشرع جعله محلا للتمليك جزاء عن استنكافه عن طاعة الله تعالى، وذلك في حق الكافر دون المسلم.[1]

ترجمہ: "اور وہ کفار غلبہ کی صورت میں ہمارے مکاتب، مدبر، ام ولد اور آزاد لوگوں کے مالک نہیں ہونگے، کیونکہ انسان میں اصل حریت ہے اور یہ حریت اللہ تعالی کے اس قول سے ثابت ہوتی ہے: "اور تحقیق ہم نے انسانوں کو بڑی عزت وشرافت سے نوازہ ہے" ہاں شریعت نے ایک خاص صورت میں انسان کو بطور سزا تملیک کا محل بنایا ہے اللہ تعالی کی عبادت سے انکار کی وجہ سے اور یہ علت کافر کے حق میں ثابت ہے نہ کہ مسلمان کے حق میں"۔

یہاں "تکریم بنی آدم" کے نص سے اس بات پر استدلال فرمایا گیا ہے کہ انسانیت میں اصل حریت ہے کیونکہ حریت کی ضد غلامی ہے جو کہ تکریم وعزت کے منافی ہے، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تکریم کا حصہ یہ بھی ہے کہ انسان معصوم الدم ہو، غلامی کی بنسبت خون مباح ہونا زیادہ ذلت ورسوائی کی بات ہے چنانچہ جس شخص کا خون مباح ہوتا ہے وہ کریم وعزیز نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بات یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ انسان میں گو اصل یہ ہے کہ وہ معصوم الدم ہو لیکن کفر طاری ہونے کے بعد یہ اصل ختم ہو جاتا ہے اور اب اس کا خون معصوم باقی نہیں رہ پاتا۔ علامہ زیلعی رحمہ اللہ ایک سوال وجواب کے ضمن میں فرماتے ہیں:

ولا يقال الأصل في الآدمي الحرية لأنه ولد آدم وحواء – عليهما السلام – وهما حران فوجب أن لا تقبل دعوى

---

[1] الاختيار لتعليل المختار، كتاب السير، ج٤ ص ١٣٤.

الـرق إلا ببينـة وكونـه في يـده لا يوجـب قبـول قولـه عليه..لأنا نقول الأصل إذا اعترض عليه مـا يـدل عـلى خلافه يبطل وثبوت اليد دليل على خلاف ذلك الأصل لأنه دليل الملك فيبطل به ذلك الأصل.[1]

ترجمہ:" یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ انسان میں تو اصل حریت ہے کیونکہ یہ حضرت آدم وحواء علیہما السلام کی اولاد ہے اور یہ دو(۲) آزاد تھے، تو ضروری ہے کہ کسی کے متعلق غلام ہونے کا دعوی قبول نہ کیا جائے مگر گواہی کے ساتھ، اور مالک کا اس پر قبضہ ہونا اس غلام کے متعلق دعوی کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ ہم اس بات کا جواب یہ دینگے کہ جب اصل (حریت) پر اس کا خلاف (رقیت) طاری ہو جائے تو اصل باطل ہو جاتی ہے، اور مالک کا اس غلام پر قبضہ ہونا اسی اصل کے خلاف دلیل ہے کیونکہ قبضہ ملکیت کی دلیل ہے تو اس کے ذریعہ یہ اصل باطل ہو جائے گی"۔

جان ومال کے معصوم ہونے کی بنیاد

عصمت کی دو قسمیں ہیں: عصمت موثمہ اور عصمت مقومہ۔

عصمت موثمہ وہ ہے جس کی خلاف ورزی کرنا موجب اثم یعنی گناہ ہو اور عصمت مقومہ وہ ہے جس کی خلاف ورزی موجب ضمان ہو۔ عصمت موثمہ کی بنیاد اسلام پر ہے، لہٰذا مسلمان جہاں بھی ہو، اس کی جان ومال محفوظ ومعصوم ہے اور کسی شرعی بنیاد کے بغیر اس کی طرف تعرض کرنا، اس کو ضائع کرنا، اس پر ناحق قبضہ جمانا ناجائز اور حرام ہے، چاہے وہ کسی

---

[1] تبيين الحقائق،كتاب الدعوى، باب ما يدعيه الرجلان،ج٤ص٣٢٨.

اسلامی ملک میں رہتا ہو یا کسی غیر اسلامی ممالک کا باشندہ ہو۔ بہر حال اس کی طرف تعرض کرنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی ناحق طور پر مسلمان کی جان ومال کو ضائع کرتا ہے تو وہ شرعاً گناہ گار ہوگا۔ لیکن کیا اس ناجائز اقدام کی وجہ سے اس پر ضمان وتاوان بھی لازم ہوگا یا نہیں؟ یہ عصمت مقومہ ہے جس کا مدار دار الاسلام میں ہونے پر ہے، لہٰذا اگر دار الاسلام میں کوئی شخص کسی مسلمان کو ناحق قتل کرتا ہے یا ناجائز طور پر اس کا مال ضائع یا ہڑپ کر جاتا ہے تو قتل کی صورت میں قصاص یا دیت وغیرہ لازم ہوگی اور مال ضائع کرنے کی صورت میں اس جیسا مال یا اس کی قیمت واجب ہوگی، اور اگر یہی اقدام دار الحرب میں ہوتا ہے تو چونکہ وہاں شرعی احکام نافذ نہیں ہوتے اس لئے وہاں نہ قصاص ودیت جاری ہوگی نہ ہی اسلامی حکومت اس بات کی پابند ہے کہ غاصب یا ناحق حملہ آور شخص سے مظلوم شخص کے مال کا ضمان لے لے۔

مفتی عمیم الاحسان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

الْعِصْمَة المؤثمة هِيَ الَّتِي تجْعَل من هتكها آثِما. الْعِصْمَة المقومة هِيَ الَّتِي يثبت بهَا للْإِنْسَان قيمَة بِحَيْثُ من هتكها فَعَلَيهِ الْقصاص وَالدية.[1]

ترجمہ: "عصمت موثمہ وہ ہے جس کی خلاف ورزی کرنے سے انسان گنہگار ہوتا ہے اور عصمت مقومہ وہ ہے جس کی خلاف ورزی سے ضمان یعنی قصاص یا دیت لازم ہوتی ہے"۔

[1] قواعد الفقه، ص: ۳۸۱.

امام سرخسی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وفقهه في هذا كله أن العصمة المقومة إنما تثبت بالإحراز باليد لا بالدين وتمام الإحراز باليد إنما يكون بمنعة المسلمين أو بدارهم، وبدون هذه العصمة لا يخرج المال من أن يكون محلا للاغتنام.[1]

ترجمہ: "ان تمام صورتوں کی وجہ یہ ہے کہ عصمت مقومہ قبضہ کے ذریعہ محفوظ کرنے کے ساتھ ثابت ہوتی ہے اور یہ کامل طریقہ سے مسلمانوں کی قوت اور دارالاسلام کے ساتھ ہی ہوگا، اور اس عصمت کے بغیر وہ مال غنیمت کے قابل رہتا ہے"

"شامی" میں ہے:

الحقن هو المنع: قال في المغرب حقن دمه إذا منعه أن يسفك. واحترز به عن مباح الدم كالزاني المحصن والحربي والمرتد، والمراد الحقن الكامل، فمن أسلم في دار الحرب فقد صار محقون الدم على التأبيد، ولا يقتص من قاتله هناك؛ لأن كمال الحقن بالعصمة المقومة

---

١ شرح السير الكبير،باب المسلم يخرج من دار الحرب ومعه مال،ج١ص: ١١٣٤.

والمؤثمة وبالإسلام حصلت المؤثمة دون المقومة؛ لأنها
تحصل بدار الإسلام، أفاده في الكفاية.[1]

ترجمہ:"حـ قن منع کرنے کو کہا جاتا ہے، لغت کی کتاب "المعـ زب" میں ہے: حـقن د مہ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب خون گرنے سے روکا جائے، اور مصنفؒ نے اس قید کے ذریعہ سے مباح الدم ہونے سے احتراز کیا ہے جیسا کہ محـ صن زانی، حربی، اور مرتد، اور مراد یہ ہے کہ اس کا خون کامل طور پر معصوم ہو، لهذا جس شخص نے دارالحرب میں اسلام میں قبول کر لیا تو وہ ہمیشہ کے لئے معصوم الدم ہو گیا لیکن اس کے قاتل سے دارالحرب میں قصاص نہیں لیا جائے گا، کیونکہ پوری طرح معصوم الدم ہونا تو عصمت مقومہ عصمت موثمہ دونوں سے ثابت ہوتا ہے اور اسلام سے عصمت موثمہ تو حاصل ہوتی ہے نہ کہ عصمت مقومہ، کیونکہ یہ تو دارالاسلام کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے"۔

قتل بجذبہ شفقت

قتل انسان کی یہ صورت چند دہائیوں پہلے مغرب میں ایجاد ہوئی اور ایک آدھ بار تجربہ کرنے کے بعد بڑے معصوم لب ولہجے کے ساتھ اس فلسفے کی نشر واشاعت شروع کی گئی جس کی وجہ سے ایک حلقہ تک یہ فکر خوب مقبول ہوا اور اس نام پر انسانیت کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے بعض مغربی شہروں میں اس کے کچھ مراکز قائم ہوئے، ہوتا یہ ہے کہ اگر کوئی انسان کسی جان لیوا مرض میں مبتلا ہو جائے اور اس کا علاج کرنا دستیاب نہ ہو

---

١ حاشية ابن عابدين على الدر المختار،كتاب الجنايات، فصل فيما يوجب القود وما لا يوجبه،ج٦ ص٥٣٢.

یا علاج کی وجہ سے اس کا شفایاب ہونا مشکل معلوم ہو تو مختلف طریقوں سے اس کو مارا جاتا ہے کیونکہ زندگی تو یوں ہی متوقع نہیں ہے تو یوں ہی تکلیف میں پڑے رہنے سے بہتر یہی ہے کہ جلد از جلد اس کو اپنے حتمی انجام تک پہنچایا جائے اور بلا وجہ مشقت میں نہ رہنے دیا جائے، پھر اس کو مارنے کے لئے عموماً دو طریقوں میں سے کوئی طریقہ اپنایا جاتا ہے یا تو کسی جان لیوا انجکشن/ دوائی وغیرہ دیکر اس کا کام پورا کیا جاتا ہے اور مزید علاج کے اسباب چھین کر اس کو موت کے نیند سلا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

شرعی نقطہ نظر سے یہ فکر سراسر غلط ہے، قرآن وسنت میں انسانی جان کو جو قدر و قیمت اور اہمیت دی گئی ہے اور اکرام واحترام کے جس منصب ومقام پر اس کو فائز کیا گیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی جان بہر حال محترم ہے وہ کتنے ہی تکلیف ومشقت میں مبتلا ہو جائے تو دیگر انسانوں کو اس کے ساتھ امداد وتعاون کر لینا چاہئے اس کی تکلیف کو دور کرنے میں اپنی استطاعت کی حد تک موثر کردار ادا کر لینا چاہئے چنانچہ احادیث مبارکہ میں اس کے بیش بہا فضائل بیان فرمائے گئے ہیں، لیکن تکلیف سے بچاؤ کے جذبہ سے اس کو مارنا اور زندگی سے محروم کرنا اس کی کسی طرح گنجائش نہیں ہے اور یہ صرف شریعت کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ عقلی لحاظ سے بھی ایسا اقدام کرنا حد درجہ مذموم ہے چنانچہ امراض وتکالیف کوئی آج کی پیداوار نہیں ہے انسانیت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور کائنات کے اس منظر نامے میں جب سے انسان ہے تو ساتھ ساتھ بیماریوں اور مصائب ومشکلات کا داستان بھی ہے لیکن آج تک کا عقل سلیم کبھی اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا کہ شفقت کے جذبے کے تحت کسی انسان کو زندہ رہنے کے حق سے ہی محروم کر دیا جائے، یہ "معصوم" فکر وفلسفہ بڑا پُر

خطرہے اگراس کو کسی معاشرے میں نافذ کیا جائے تو وہاں شفقت ورحمت کے عنوان کے تحت بہت سے قتل ناروا کے دروازے کھل جانے کا قوی اندیشہ ہے۔

قتل بجذبہ شفقت کی ایک واضح نظیر

"شفقت اور رحمت کے جذبے سے قتل" کرنے کی ایک واضح نظیر خود عہد رسالت (علیٰ صاحبہا الوف الوف تحیات وتسلیمات) میں بھی پیش آچکا تھا، اور حضور نبی کریم ﷺ نے اس کی خوب خوب مذمت فرمائی تھی، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

شهدنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم حنينا، فقال لرجل ممن يدعى بالإسلام: «هذا من أهل النار»، فلما حضرنا القتال قاتل الرجل قتالا شديدا، فأصابته جراحة، فقيل: يا رسول الله، الرجل الذي قلت له آنفا: «إنه من أهل النار» فإنه قاتل اليوم قتالا شديدا، وقد مات، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: «إلى النار»، فكاد بعض المسلمين أن يرتاب، فبينما هم على ذلك إذ قيل: إنه لم يمت، ولكن به جراحا شديدا، فلما كان من الليل لم يصبر على الجراح، فقتل نفسه، فأخبر النبي صلى الله عليه وسلم بذلك، فقال: «الله أكبر، أشهد أني عبد الله ورسوله»، ثم أمر بلالا فنادى في الناس: «أنه لا يدخل

الجنة إلا نفس مسلمة، وأن الله يؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر»[1]

ترجمہ: "ہم نے آپ ﷺ کے ساتھ غزوہ حنین میں شرکت کی تو اس موقع پر آپ ﷺ نے ایک ایسے شخص کے متعلق فرمایا کہ یہ جہنمی ہے جو بظاہر اسلام کا دعویدار تھا پھر جب ہم میدان جہاد میں اترے تو اس شخص نے بہت ہی سخت قتال کیا اور اس کے جسم پر کئی زخم بھی لگے، تو عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ جس شخص کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ یہ جہنمی ہے آج تو اس نے بہت ہی سخت قتال کیا اور اب وہ انتقال ہو گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے تو قریب تھا کہ بعض مسلمان شک میں پڑ جاتے، ابھی مسلمان اسی حالت میں تھے کہ خبر آئی کہ وہ شخص ابھی تک نہیں مرا لیکن اس کا جسم بہت زخمی ہے جب رات کا وقت ہوا اور وہ شخص زخموں کی تاب نہ لا سکا تو اس نے خودکشی کر لی، آپ ﷺ کو جب اس کی اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ اکبر میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ تعالی کا بندہ اور رسول ہوں، پھر آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم فرمایا تو انہوں نے لوگوں میں اس بات اعلان فرمایا کہ جنت میں صرف مسلمان ہی داخل ہو گا، اور بیشک کبھی اللہ تعالی اس دین کی نصرت و مدد فاسق شخص کے ذریعہ سے بھی فرماتے ہیں"

اس روایت میں صراحت ہے کہ شخصِ مذکور نے شدید زخمی ہونے اور زخم و درد کی تاب نہ لانے کی وجہ سے اپنے آپ کو قتل کیا تھا جس طرح کسی دوسرے معصوم شخص کو قتل کرنا حرام و گناہ کبیرہ ہے یوں ہی خود اپنے آپ کو قتل کرنے کا بھی یہی حکم ہے، دونوں

---

[1] صحيح مسلم،باب غلظ تحريم قتل الإنسان نفسه.

کے درمیان اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے، اب حدیث میں مذکورہ قصے میں یہی صورت حال ہے کہ شدید زخمی ہونے کے بعد مزید زندہ رہنے کی توقع باقی نہ رہی تھی اور تکلیف ودرد کا احساس زیادہ تھا تو اپنے اوپر شفقت ورحمت کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی اقدام کر کے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہمیشہ کی نیند سو یا جائے اور شخصِ مذکور نے یہی کام کیا لیکن حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس کی خوب مذمت فرمائی اور اس باب میں تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے۔

اس لئے شرعی لحاظ سے کوئی ایسا اقدام کرنا جس سے مریض یا مصیبت زدہ شخص کی موت واقع ہو جائے، جائز نہیں ہے اس سے احتراز کرنا لازم ہے، یہ مریض کے ساتھ رحمت یا شفقت نہیں ہے بلکہ ظلم وتعدی ہے کہ زبردستی اس کا حقِ زندگی چھینا جا رہا ہے۔

جذبہ شفقت کے تحت مریض کا علاج چھوڑنا

البتہ اس "جذبہ شفقت" کے تحت بعض اوقات ایسی صورت بھی اختیار کی جاتی ہے جس میں براہ راست قتل کرنے کا کوئی اقدام نہیں کیا جاتا لیکن ضروری علاج ومعالجہ روک لیا جاتا ہے جس کے بعد مریض خود بخود جان بحق ہو جاتا ہے، سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا "قتل" کی یہ صورت جائز ہے؟

غور کیا جائے تو یہ بظاہر قتل انسان کی صورت نہیں ہے بلکہ ترک تدبیر اور علاج چھوڑنے کی شکل ہے اس لئے علاج وغیرہ تدابیر کرنے کا جو حکم ہے وہی اس کا بھی ہونا چاہئے اور حضرات فقہائے کرام نے علاج ومعالجہ کو "اسباب مظنونہ" میں سے قرار دیا جس کو اختیار توکل وتفویض کے خلاف نہیں ہے اور چھوڑنا ناجائز اور خودکشی کے حکم میں نہیں

ہے اس لئے فی نفسہ اس کی گنجائش ہونی چاہئے چنانچہ بعض اہلِ علم نے یہی موقف اپنایا،[1] لیکن دوسری طرف جب غور کیا جاتا ہے تو درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں کہ :

ا۔ جس جذبہ کے تحت علاج چھوڑا جاتا ہے وہ جذبہ درست نہیں ہے، لہٰذا اگر علاج ومعالجہ کو محض مباح بھی قرار دیا جائے تو بھی مباح امور کا حکم نیت واغراض کے بدلنے سے بدل جاتا ہے۔

۲۔ یہاں قتل کا اقدام ومباشرت تو نہیں ہے لیکن شدید ضرورت کے وقت ایک مسلمان کی حاجت روائی سے ہاتھ کھینچنا بجائے خود قابل مذمت کام ہے خصوصاً جب استطاعت کے باوجود اور بدفالی کے جذبہ سے ایسا کیا جائے، یہاں یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ بے شک ایک مسلمان کے ساتھ تعان کرنے سے اعراض کیا جارہا ہے لیکن کسی بدنیتی کی وجہ سے ایسا نہیں کررہا بلکہ مریض کے ساتھ خیر سگالی کے جذبے کے تحت وہ یہ اقدام کررہا ہے تو خواہ مخواہ اس کو مذموم کہنے کی کیا وجہ ؟

ایک سرسری اعتراض اوراس کا جواب

یہ شبہ ظاہر بین دماغ کا اختراع کردہ ہے جس فکرودماغ کی رسائی مادی زندگی اوراس کے نفع ونقصان کی حد تک محدود ہو اور یہی اس کے سوچ کا محور اور منتہائے مقصود ہو تو بلا شبہ اس کی آخری اور حتمی تجویز یہی ہوگی کہ بے کار تکلیف میں پڑے رہنے اور درد والم میں کراہنے کا کیا فائدہ ؟ جب مادی لحاظ سے اس کے وجود کا کوئی خاص غرض نہ رہا تو بہتر یہی

[1] مزید تفصیل کے لئے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب رحمہ اللہ کی کتاب "مباحث فقہیہ "ص 377 تا 405 ملاحظہ فرمائی جائے جہاں اس مسئلہ سے متعلق متعدد اہل علم حضرات کا موقف ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ نے اپنا نقطہ نظر بڑی تفصیل وتنقیح کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

ہے کہ عزت کے ساتھ رخصت کر دیا جائے، یوں ہی پڑے رہنے میں مادی لحاظ سے اپنا بھی نقصان ہے اور لواحقین پر بھی بے پنا بوجھ کا باعث ہے۔

لیکن دینی اور مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مریض کا درد و تکلیف میں مبتلا ہونا عبث اور بے کار نہیں ہے بلکہ مصیبت کے ان لمحوں کو بھی بیش بہا اجر وثواب کمانے اور جمع کرنے کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے، لواحقین کے لئے اس کے نان ونفقہ کا خیال رکھنا اور اس کی جانی وجسمانی طور پر نگہداشت رکھنا ان پر نرا بوجھ یا ان کی طرف سے احسان نہیں ہے بلکہ انسانی جان کے تحفظ کے لئے یہ ان کی شرعی واخلاقی ذمہ داری ہے اور وہ چاہیں تو صدق نیت اور حسن کار کردگی کو اپنا کر بے پنا نیکیاں اور فضائل حاصل کر سکتے ہیں جو بنی نوع انسان کی اصل مقصودِ زندگانی ہے، اسی طرح خود غرض اور مادی نفع کی حرص ولالچ کے اس انتہائی دور میں جب قرآن وسنت کی طرف سے انسان کے لئے گرہ کشائی ہو جاتی ہے تو عیاں ہو جاتا ہے کہ محض کسی شخص کا مادی لحاظ سے بے کار پڑا رہنا کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی بنیاد پر اس سے اس کا حق زندگی چھین لیا جائے اور کسی طرح اس کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی جائے۔

ترکِ علاج کا حکم

تیسرا بنیادی نکتہ جس پر اپنی جگہ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس دوسری صورت میں گنجائش کی بنیاد یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں محض ترکِ علاج ہے جو کہ کوئی ناجائز نہیں ہے کیونکہ علاج وتداوی کرنا شرعاً واجب نہیں ہے چنانچہ فقہی کتابوں میں اس بات کی صراحت ملتی ہے کہ اگر کوئی شخص علاج ومعالجہ چھوڑے اور یوں مر جائے تو وہ

گناہگار نہیں ہوگا، اگر کھانا پینا چھوڑدے اوراس کی وجہ سے انتقال ہو جائے تو سخت گناہ گار بلکہ خودکشی کرنے والا شمار ہوگا، مثلاً "فتاویٰ شامی" میں ہے:

إن ترك الأكل والشرب حتى هلك فقد عصى؛ لأن فيه إلقاء النفس إلى التهلكة وإنه منهي عنه في محكم التنزيل اهـ بخلاف من امتنع عن التداوي حتى مات إذ لا يتيقن بأنه يشفيه.[1]

ترجمہ: "اگر کسی نے کھانا پینا چھوڑ دیا یہاں تک وہ اس کی وجہ سے مر گیا تو وہ گنہگار ہوگا کیونکہ اس نے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا اور قرآن کریم میں اس سے منع کیا گیا ہے، ہاں اگر کسی نے بیماری کی حالت میں دوائی استعمال کرنا چھوڑ دی اور وہ مر گیا تو وہ گنہگار نہ ہوگا کیونکہ اس دوائی سے شفایاب ہونا یقینی نہیں تھا"۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

اعلم بأن الأسباب المزيلة للضرر تنقسم إلى مقطوع به كالماء المزيل لضرر العطش والخبز المزيل لضرر الجوع وإلى مظنون كالفصد والحجامة وشرب المسهل وسائر أبواب الطب أعني معالجة البرودة بالحرارة ومعالجة الحرارة بالبرودة وهي الأسباب الظاهرة في الطب وإلى موهوم كالكي والرقية أما المقطوع به فليس تركه من التوكل بل تركه حرام عند خوف الموت وأما الموهوم

---

[1] حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة، ج٦ ص٣٣٨.

فشرط التوكل تركه إذ به وصف رسول الله – صلى الله عليه وسلم وآله – المتوكلين وأما الدرجة المتوسطة وهي المظنونة كالمداواة بالأسباب الظاهرة عند الأطباء ففعله ليس مناقضا للتوكل بخلاف الموهوم وتركه ليس محظورا بخلاف المقطوع به بل قد يكون أفضل من فعله في بعض الأحوال وفي حق بعض الأشخاص فهو على درجة بين الدرجتين.[1]

ترجمہ: "جو اسباب ضرر کو زائل کرتے ہیں اس کی چند قسمیں ہیں: اسمیں بعض یقینی ہیں جیسے: وہ پانی جو پیاس ختم کرے یا وہ روٹی جو بھوک کو مٹائے اور اس میں بعض اسباب ظنی ہیں جیسے: پچھنا اور حجامہ لگوانا، مسہل دوا استعمال کرنا اور اسی طرح طب کے دیگر تمام طرُق، یعنی برودت کا علاج حرارت سے کرنا اور حرارت کا علاج برودت سے کرنا اور یہ طب کے ظاہری اسباب ہیں، اور بعض اسباب موھوم ہیں جیسے: داغ لگانا، دم و تعویذ کرنا۔ جہاں تک یقینی اسباب ہیں اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو چھوڑنا توکل نہیں بلکہ جب موت کا خطرہ ہو تو چھوڑنا حرام ہے، جہاں تک موھوم اسباب ہیں اس کا حکم یہ ہے کہ توکل کے لئے اس کا چھوڑنا ضروری ہے کیونکہ آپ ﷺ نے متوکلین کی علامت یہ ارشاد فرمائی ہے کہ وہ موھوم اسباب کو چھوڑ دے، اور درمیانی درجہ اسباب ظنیہ کا ہے جیسے: ڈاکٹری علاج کرنا اسباب ظاہرہ کے ساتھ، ان اسباب کو اختیار کرنا توکل کے

---

[1] الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات، ج٥ ص٣٥٥.

منافی نہیں، بر خلاف موہوم اسباب کے کہ ان کو چھوڑنا منع نہیں اور یقینی اسباب کو چھوڑنا درست نہیں، اور اسباب ظنیہ کو بعض اوقات اور بعض افراد کے حق میں اختیار کرنا ہی افضل ہوتا ہے، تواس کو متوسط درجہ حاصل ہے"۔

مختلف قسم کے علاج اور ان کا حکم

لیکن یہ بات قابلِ تحقیق ہے ، علاج و معالجہ کی ہر صورت کو تمام حالات میں صرف مباح قرار دینا قابل غور ہے، قدیم فقہائے کرام کی فقہی کتابوں میں گواس بات کی تصریح موجود ہے جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ وشامی کے حوالہ سے ابھی ذکر کیاجاچکا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا دار مدار تجربہ پر ہے۔ اصل ضابطہ یہ ہے کہ زندگی اور جان اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، حتی الامکان اس کی حفاظت ضروری ہے، اگر بیماری وغیرہ عوارض لاحق ہو جائیں جس کی وجہ سے جان جانے اور زندگی ختم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ایسی حالات میں انسان اپنی استطاعت کی حد تک پابند ہے کہ اپنی حفاظت کرے ، بلا ضرورت جان کھودینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ یہ اصل ضابطہ ہے اب کھانے پینے سے چونکہ تجربہ ہے کہ جان بچ جاتی ہےاور انسان بھوک وپیاس کی وجہ سے مرنے سے محفوظ رہ جاتا ہے اس لئے ضرورت کے وقت بقدر ضرورت کھانا پینا شرعاًضروری ہے ،اگر کوئی قدرت کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتااور جان کھوبیٹھتا ہے تو وہ گناہ گار ہوگا، لیکن ہر علاج ودواء کے متعلق ایسا تجربہ نہیں ہوااس لئے اس کا حکم کھانے پینے کا نہیں ہے جس کے چھوڑنا ناجائز قرار دیاجائے ، اگر کوئی ایسا علاج یا کوئی ایسی دواء دستیاب ہو جائے جس کے متعلق تجربہ کرنے کے بعد دیانتدار ماہرین فیصلہ کریں کہ اس کے استعمال کرنے سے یقین یاغالب گمان کے مطابق جان بچ جاتی ہے تواستطاعت کے مطابق ایسی تدبیر اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

باب دوم:

قتل مسلم واجب ہونے کی صورتیں

تین صورتوں میں قتل کرنا ضروری ہے

صحیح بخاری کی روایت ہے:

عن عبد الله، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لا يحل دم امرئ مسلم، يشهد أن لا إله إلا الله وأني رسول الله، إلا بإحدى ثلاث: النفس بالنفس، والثيب الزاني، والمارق من الدين التارك للجماعة "[1]

ترجمہ: "حضرت عبداللہؓ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل ہے کہ: "اس مسلمان کا خون گرانا حلال نہیں جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالی ہی معبود ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں، مگر اس سے تین (۳) صورتیں مستثنی ہیں: نفس کو نفس کے بدلے قصاصا قتل کیا جائے گا، محصن زانی کو بطور حد قتل کیا جائے گا، ایسے مرتد کو قتل کیا جائے گا جو مسلمانوں کی جماعت چھوڑنے والا ہو"۔

اس حدیث مبارکہ سے صراحت کے ساتھ صرف تین صورتوں میں مسلمان قتل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور وہ بھی کلمہ حصر کے ساتھ، کہ مسلمان کو صرف

---

[1] صحيح البخاري،باب قول الله تعالى:أن النفس بالنفس والعين بالعين،رقم الحديث: ٦٨٧٨.

انہی تین صورتوں میں قتل کیاجاسکتا ہے ان کے علاوہ کسی صورت میں مسلمان کو قتل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

پہلی صورت: قصاص

ایک صورت قتلِ عمد کی ہے کہ کوئی مسلمان کسی معصوم شخص کو قصداً عمداً قتل کرے، معصوم سے مراد یہ ہے کہ قاتل کے لئے اس کا خون شرعاً مباح نہ ہو تو قصاص میں قاتل کو کیاجائے گا البتہ قصاص میں کسی کو قتل کرنے کے لئے کچھ مخصوص شرائط کی پابندی ضروری ہے اور وہ شرائط موجود ہوں تب ہی حکومت کو قاتل سے قصاص لینے کی اجازت ہوسکتی ہے، لہٰذا اگر وہ تمام شرائط موجود ہوں اور مقتول کے ورثاء قاتل سے قصاص لینے کا مطالبہ کریں توان کے مطالبہ پر قاتل کو قتل کرنالازم ہے۔

دوسری صورت: سنگسار کرنا

دوسری صورت زنا کی ہے، اگر کوئی مسلمان مرد یاعورت محصن ہےاوراس کے باوجود وہ زنا کرےاوراس کا یہ جرم گواہوں یاخوداپنےاقرارسے حاکم کے ہاں ثابت بھی ہوجائے تو قاضی کے لئے ایسے زانی کو قتل کرناضروری ہے اور یہ قتل حدوداللہ میں سے ہے جس کا حکم یہ ہے کہ ایک مرتبہ جرم ثابت ہوجانے کے بعد قاضی/حاکم کے لئے اس کو معاف کرنا/معطل کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے بلکہ بہر حال حد قائم کرنا ہی لازم اور اللہ تعالیٰ کاضروری حق ہے۔

تیسری صورت: ارتداد

تیسری صورت "مارق من الدین" کی ہے کہ کوئی شخص دین اسلام چھوڑ کر کوئی اور دین اپنائے مثلاً یہودی، نصرانی یا قادیانی وغیرہ ہوجائے تو اولاً ایسے شخص کو تین دن تک

مہلت دی جائے گی اور دین اسلام کے متعلق اس کے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، اگر اس دوران دوبارہ مسلمان ہو جاتا ہے تو بہت اچھا، ورنہ اس کے بعد وہ کفر پر اصرار کرتا رہا تو اس کو قتل کرنا ضروری ہے۔ بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

«من بدل دينه فاقتلوه".[1]

ترجمہ: "جو شخص مرتد ہو جائے تو اسے قتل کر ڈالوں"

درجِ بالا حدیث شریف میں آخری لفظ "التارک للجماعۃ" بعض طرق میں "تارک" کے بجائے "مفارق" کا لفظ ہے اس سے کیا مراد ہے؟ بعض محدثین نے اس کو ما قبل کلمہ کے لئے صفت قرار دیکر اس سے مرتد ہی مراد لیا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت چھوڑ کر کافر ہو جائے جبکہ بعض نے یہاں مسلمانوں کی جماعت چھوڑنے سے بغاوت مراد لیا ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ باغی کا قتل کرنا بھی جائز ہے اور اس حدیث میں منصوص ہے، لیکن بظاہر دوسری توجیہ ہی مناسب ہے۔ اس دوسری توجیہ میں ایک تو حدیث کے سابقہ حصے پر عمل نہیں ہو پائے گا کیونکہ وہاں قتل مسلم کے جائز ہونے کی تین وجوہات بیان کی گئی تھیں جبکہ اس توجیہ کے مطابق چار اسباب بن جاتے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اسی حدیث کے بعض طرق کو دیکھ کر اس توجیہ کا کوئی امکان واحتمال باقی نہیں رہتا کہ وہاں اس صفت کے بجائے صاف طور پر ارتداد کا ذکر ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، باب حكم المرتد والمرتدة واستتابتهم،رقم الحديث: ٦٩٢٢.

والمراد بالجماعة جماعة المسلمين أي فارقهم أو تركهم بالارتداد فهي صفة للتارك أو المفارق لا صفة مستقلة وإلا لكانت الخصال أربعا وهو كقوله قبل ذلك مسلم يشهد أن لا إله إلا الله فإنها صفة مفسرة لقوله مسلم وليست قيدا فيه إذ لا يكون مسلما إلا بذلك ويؤيد ما قلته أنه وقع في حديث عثمان أو يكفر بعد إسلامه أخرجه النسائي بسند صحيح وفي لفظ له صحيح أيضا ارتد بعد إسلامه وله من طريق عمرو بن غالب عن عائشة أو كفر بعد ما أسلم وفي حديث بن عباس عند النسائي مرتد بعد إيمان قال بن دقيق العيد الردة سبب لإباحة دم المسلم بالإجماع في الرجل وأما المرأة ففيها خلاف.[١]

ترجمہ: " اور یہاں حدیث میں "جماعت" سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے، مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے، اس صورت میں یہ لفظ "التارک" یا "المفارق" کی صفت ہو گی مستقل جملہ نہیں ہو گا ورنہ مباح الدم ہونے کی چار (۴) صورتیں بن جائے گی اور یہ بھی ما قبل والے اس جملہ کی طرح ہے: "مسلم یشہد أن لا إلہ إلا اللہ" کیونکہ اس میں

---

[١] فتح الباري،كتاب الديات،قوله باب قول الله تعالى أن النفس بالنفس والعين بالعين،ج١٢ص٢٠١.

یسٓ شھد اَن لاإ ٰ ٰلہ إلا اللہ لفظ مسلم کی تفسیر ہے اس کے لئے قید نہیں کیونکہ اس گواہی کے ساتھ ہی انسان مسلمان ہوتا ہے، اور اس بات کی تائید حدیث عثمانؓ سے ہوتی ہے جس کو امام نسائیؒ نے سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اسلام قبول کرنے بعد کافر ہو جائے، اور امام نسائیؒ ہی نے سند صحیح کے ساتھ دوسری روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: کہ اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے، اور عمرو بن غالب عن عائشہ کی سند سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرلے، اور نسائی میں ہی حدیث ابن عباسؓ کے الفاظ یوں ہے: ایمان کے بعد مرتد ہو جائے، ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں: کہ مرتد ہونا بھی مسلمان کے خون کو مباح کر دیتا ہے، مرد کے متعلق تو یہ مسئلہ اجماعی ہے اور عورت کے متعلق اختلاف ہے"۔

اس توجیہ میں تیسرا اشکال یہ بھی ہے کہ باغی کو قتل کرنا شریعت کا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی بغاوت وشر کو دفع کرنا مقصود ہوتا ہے چنانچہ اگر قتل وقتال کے بغیر باتوں اور مذاکرات سے بغاوت دور کیا جاسکے تو قتل وقتال کی اجازت نہیں ہے، اگر لڑائی کے دوران باغی خود بخود میدان چھوڑ کر بھاگ جائے تو ان کا پیچھا کر کے خواہ مخواہ ان کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی لازم نہیں ہے۔

تین صورتوں میں انحصار کیوں؟

لیکن یاد رہے کہ ضرورت کے وقت قتلِ مسلم ناجائز بھی نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں مباح جبکہ بعض واجب وضروری بھی بن جاتا ہے، اسی طرح بغاوت کے علاوہ دیگر متعدد جرائم میں بھی قتلِ مسلم کی شرعاً اجازت ہوتی ہے، اب سوال یہ ہوتا ہے کہ حدیث میں تو حصر کے ساتھ محض تین ہی صورتوں میں قتل کرنے کی اجازت دی گئی تو ان

تین کے علاوہ دیگر اسباب کی وجہ سے کیونکر قتل کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟اس سے تو حصر ختم ہو جائے گااور اس کا کوئی فائدہ ہی نہیں رہے گا؟

انحصار کی پہلی توجیہ

اس کا جواب یہ ہے کہ محدثین کرام کی یہاں دو رائے ہیں: بعض کے نزدیک تو جن اسباب کی وجہ سے بھی قتل مسلم کی اجازت دی جاتی ہے وہ تمام اسباب مآلِ کار انہی تین صورتوں میں سے کسی صورت کے تحت داخل ہو جاتی ہے اس لئے حصر بھی اپنی جگہ برقرار ہے اور دیگر صورتوں میں قتل مسلم کا جائز ہونا اس حصر کے منافی نہیں ہے۔امام زین الدین بن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے درج بالا تشریح میں بڑے بسط وتفصیل کے ساتھ قتلِ مسلم کی ان صورتوں کو جمع فرمایا ہے جن میں مختلف احادیث یا دیگر دلائل ووجوہات کی بناء پر فقہاء کرام کے ہاں مسلمان کو قتل کرنا جائز ہے اور ہر ہر صورت کو انہی سابقہ تین اسباب کے تحت ہی داخل فرمایا ہے یا ان تین میں سے کسی ایک کے قائم مقام قرار دیا ہے، چنانچہ خاصی تفصیل کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

فرجعت نصوص القتل كلها إلى ما في حديث ابن مسعود رضي الله عنه بهذا التقدير ولله الحمد.[1]

ترجمہ:"قتل کے بارے میں تمام عبارات حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کی طرف لوٹتی ہے اور اس تطبیق پر اللہ تعالی کا شکر ہے"

علامہ کشمیری رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے، وہ فرماتے ہیں:

---

[1] جامع العلوم والحكم،الحديث الرابع عشر،ج١ ص٣٢٩.

قوله: (والمفارق لدينه، التارك للجماعة) هل المفارقة للدين، وترك الجماعة أمر، أو معناهما واحد؟ فهما رأيان، فإن كان الأول كان من موجبات القتل أربعا، وإلا ثلاثا، ثم إن موجبات القتل سواها بعد تنقيح المناط، راجعة إلى هذه الأمور، فهي أصول ودعامة. وعن أحمد: يجوز قتل كل مبتدع.[1]

ترجمہ: "حدیث میں "والمفارق لدینہ، التارک للجماعۃ" دونوں جملوں کا کیا الگ الگ معنی ہے یا ایک ہی مطلب ہے؟ اس دونوں اقوال کو محدثین نے اختیار کیا ہے، پہلے قول کے مطابق موجبات قتل چار (۴) ہو جائنگے اور دوسرے قول کے مطابق تین (۳) ہونگے، پھر ان صورتوں کے علاوہ قتل کی جو صورتیں ہیں چھان بین کے بعد وہ تمام صورتیں ان ہی تین (۳) صورتوں کی طرف لوٹتی ہیں تو یہ ایک اصول وضابطہ ہے، اور امام احمدؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہر بدعتی کا قتل جائز ہے"۔

انحصار کی دوسری توجیہ

دوسری توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث، جس میں قتلِ مسلم کے جواز کو تین ہی صورتوں میں منحصر فرمایا گیا ہے، عام مخصوص عنہ البعض ہے چنانچہ محارب اور صائل وغیرہ کی صورتیں اس سے مخصوص ہیں اور وہاں قتل مسلم بالکل جائز ہے، اور عام مخصوص کا حکم یہی ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ تخصیص ثابت

---

[1] فيض الباري، باب قول الله تعالى: أن النفس بالنفس والعين بالعين، ج٦ ص٣٧٨.

ہو جانے کے بعد خبر واحد اور قیاس کے ذریعے سے مزید تخصیص کی جاسکتی ہے کیونکہ تخصیص کے بعد ہمارے نزدیک بھی عام کی قطعیت برقرار نہیں رہتی بلکہ ظنی رہ جاتا ہے اور خاص چونکہ قطعی ہوتا ہے اس لئے اگر کوئی دلیل خاص ایسے عام کے ساتھ معارض آجاتا ہے تو اسی خاص پر عمل کیاجائے گا اور عام پر عمل کرنے کی صورت یہی ہو گی کہ تخصیص کے علاوہ دیگر افراد کی حد تک اس پر عمل کیاجائے ، لہٰذا جس صورت میں کوئی خبر صحیح آجائے اور وہ اس بات پر دلالت کرے کہ اس جرم کی وجہ سے مسلمان کو قتل کیاجاسکتا ہے تو اصول کے مطابق اس خبر کو قبول کیاجائے گا اور اس پر عمل کیاجائے گا،البتہ قتلِ مسلم چونکہ نہایت پُر خطر معاملہ ہے اور بیسیوں نصوص اس کی حرمت وشناعت پر پر دال ہیں اس لئے اس معاملہ میں علمی و عملی ہر لحاظ سے پوری احتیاط وتدبر کرنا ضروری ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ کی تین توجیہات

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں:

وأما قوله صلى الله عليه وسلم والتارك لدينه المفارق للجماعة فهو عام في كل مرتد عن الإسلام بأي ردة كانت فيجب قتله إن لم يرجع إلى الإسلام قال العلماء ويتناول أيضا كل خارج عن الجماعة ببدعة أو بغي أوغيرهما وكذا الخوارج والله أعلم واعلم أن هذا عام يخص منه الصائل ونحوه فيباح قتله في الدفع وقد يجاب

عن هذا بأنه داخل في المفارق للجماعة أو يكون المراد لا
يحل تعمد قتله قصدا إلا في هذه الثلاثة والله أعلم.١

ترجمہ: "اور جہاں تک آپ ﷺ کا یہ قول ہے "التارک لدینہ المفارق للجماعۃ" تو یہ ہر مرتد کے بارے میں عام ہے اگر مرتد دوبارہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کا قتل واجب ہے، اور علماء فرماتے ہیں کہ یہ اس شخص کو شامل ہے جو بدعت یا بغاوت یا اس علاوہ اور کسی ذریعہ سے مسلمانوں کی جماعت سے نکلنے والا ہو، اور اسی طرح یہ حکم خوارج کو بھی بظاہر شامل ہے واللہ اعلم، یہ بات یاد رہے کہ یہ ایسا عام ہے جس سے حملہ آور، اور اس جیسے دیگر افراد کو خاص کیا گیا ہے لہذا اپنی دفاع کی غرض سے اس کو قتل کرنا مباح ہے، اور تحقیق اس کا جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ یہ بھی "المفارق للجماعۃ" میں داخل ہے یا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو قصدا قتل کرنا جائز نہیں مگر صرف ان تین (۳) صورتوں میں، واللہ اعلم"۔

اس عبارت سے درج ذیل تین توجیہات معلوم ہوئی:

۱۔ دیگر دلائل کی وجہ سے حصر والی حدیث میں تخصیص کی جائے (البتہ تخصیص کی تفصیل میں فقہاء احناف و شوافع کی رائے مختلف ہے، اس اختلاف رائے کی بنیاد یہ ہے کہ ہمارے حنفیہ کے نزدیک عام (جب تک کہ اس میں تخصیص نہ ہو جائے) و خاص دونوں

---

١ شرح النووي على مسلم ،باب ما يباح به دم المسلم.

قطعی ہیں لہٰذا خاص عام پر مقدم نہیں ہو گا جبکہ شوافع اور دیگر بہت سے اصولیین کے ہاں خاص عام کے مقابلہ میں مقدم کیا جائے گا)

۲۔ قتلِ مسلم کی دیگر وجوہات کو بھی انہی تین کے ساتھ ملحق قرار دیا جائے۔

۳۔ حدیثِ حصر میں مطلقِ قتل کا حصر نہیں ہے بلکہ قتلِ مقصود کا انحصار مقصود ہے کہ ان تین صورتوں میں قتلِ مسلم مقصود ہوتا ہے، باقی صورتوں میں خود قتل مقصود نہیں ہوتا ، مثلاً صائل، باغی، زانی اور سارق وغیرہ صورتوں میں جہاں قتل مسلم کی اجازت دی جاتی ہے وہاں خود قتل کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ شر و معصیت دفع کرنا مقصود ہوتا ہے جس کی ایک شکل قتل کرنا بھی ہے جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آجائے گی ان شاءاللہ۔

ڈاکہ ڈالنے والے کو قتل کرنا

قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

{إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَّ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (٣٣) إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ}[1]

---

[1] [المائدة: ٣٣، ٣٤]

ترجمہ:"بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کیا جائیں یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں، یا الٹے طور پر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے، یہ تو ان کی دنیاوی سزا ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا سخت عذاب ہے، ہاں جو لوگ گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کر لے تو یقین کر لو کہ اللہ تعالی بہت بخشش رحم کرنے والا ہے"۔

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کی سزا ذکر کی گئی ہے جو اللہ تعالٰی اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محاربہ کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محاربہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے جان ومال پر ڈاکہ ڈالتے ہیں جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی فرد یا چند افراد مل کر جھتہ بنائے اور لوگوں کو راستہ میں لوٹتے و مارتے رہے جس کو ہمارے ہاں ڈاکو سے تعبیر کیا جاتا ہے، آیت کریمہ میں چار مختلف قسم کی سزائیں ذکر فرمائی گئی ہیں، ہمارے فقہاء احناف کے نزدیک اس میں تفصیل یہ ہے کہ:

1۔اگر انہوں معصوم مال یعنی کسی مسلمان یا ذمی کا مال اس طرح زبردستی لے لیا اور ہر شریک کے حصہ میں دس درہم کے بقدر مال پہنچے تو اس ان کے ہاتھ پاؤں کو الٹے طور پر کاٹا جائے گا یعنی دایاں ہاتھ تو بایاں پاؤں،

2۔اگر ڈاکہ میں مال تو نہیں لیا لیکن کسی کو قتل کیا تو اس کے بدلے ان کو قتل کیا جائے گا۔

3۔اگر مال میں بھی ے لیں اور قتل بھی کریں تو اس میں اختیار ہے کہ یا تو الٹے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کیا جائے اور پھر سب کو سولی پر چڑھایا جائے یا ہاتھ پاؤں کاٹے بغیر یوں

ہی قتل کر کے سولی پر چڑھایا جائے یا حاکم مصلحت سمجھے تو محض قتل کرنے پر بھی اکتفاء کر سکتا ہے

4۔اگر لوگوں کو صرف ڈرائے دھمکائیں لیکن نہ کسی کو قتل کرے یا ان کا ناحق مال لے لیں تو ایسے ڈاکوؤں کو جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

اس کو "حد حرابہ" کہا جاتا ہے اس کو عام قصاص سے الگ مستقل حد شمار کرنے کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ بعض صورتوں میں یہاں اگر اولیاء مقتول ایسے ڈاکوؤں کو معاف بھی کرنا چاہیں تو اس کا اعتبار نہیں ہے اور ان کو قتل کرنا ضروری ہوتا ہے، "الاختیار" میں ہے:

وإن قتلوا ولم يأخذوا مالا قتلهم ولا يلتفت إلى عفو الأولياء) لأنه إنما يقتلهم حدا حقا لله تعالى، ولا يصح العفو عن حقوق الله تعالى.[1]

ترجمہ:" اگر ڈاکوؤں نے صرف قتل کیا اور مال نہیں لیا تو حاکم ان کو قتل کرے گا اور اولیاء کی معافی کی طرف توجہ نہیں دے گا کیونکہ ان کو حدا قتل کیا جائے گا جو کہ اللہ تعالی کا حق ہے جس کو انسان معاف نہیں کر سکتا"۔

---

[1] الاختيار لتعليل المختار، فصل حد قطع الطريق، ج٤ ص١١٤.

باب سوم:

قتلِ مسلم مباح ہونے کی صورتیں

سابقہ باب میں قتل مسلم کی جو صورتیں ذکر کی گئیں ہیں، وہاں تو مسلمان کا قتل کرنا ضروری ہو جاتا ہے، یہاں ان صورتوں کا ذکر کرنا مقصود ہے جہاں قتل کرنا واجب تو نہیں ہے تاہم حرام و ممنوع بھی نہیں ہے بلکہ مباح ہو جاتا ہے۔ قتل کی یہ قسمیں چونکہ بیشتر فقہی لحاظ سے "تعزیر" میں داخل ہیں، اس لئے پہلے تعزیری سزا کے متعلق چند بنیادی باتیں ذکر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ حدود و قیود برقرار رہیں۔ اس کے بعد مباح قتل کی بعض صورتوں کی تفصیل ذکر کی جائے گی ان شاءاللہ۔

تعزیری قتل کے متعلق چند احکام

قصاص، رجم اور حد حرابہ کے علاوہ قتل مسلم کی جتنی صورتیں ہیں، وہ سب قتل تعزیری کے قبیل سے ہے جہاں تعزیر کے طور پر قتل کیا جاتا ہے، ان صورتوں کی تفصیل میں جانے سے پہلے تعزیر کے متعلق چند ضروری امور کو ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تعزیر کون دے؟

تعزیر کا بڑا مقصود یہ ہے کہ جرم کی بیخ کنی ہو، عینِ جرم کے وقت تعزیر دینے سے اسی وقت جرم کا صادر ہونا بند ہو جاتا ہے اور جرم کے بعد تعزیر قائم کرنے سے آئندہ کے لئے لوگ اس جرم سے بچنے کو کوشش کرنا شروع کرتے ہیں، اب جرم اگراللہ تعالی کی نافرمانی اور شرعی احکام کے پامالی کی شکل میں ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے جرم کو روکنے کا حق بلکہ

اپنی حد تک اس کی ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اس لئے ہر مسلمان تعزیر قائم کر سکتا ہےاور اس جذبہ کے تحت تعزیر دینا نہی عن المنکر ہی کی ایک شکل ہے جو ایک عبادت اور کارِ ثواب ہے، البتہ جرم وجود میں آجائے تو اس کے بعد اس جرم کی سزا جاری کرنا یہ انتظامی معاملہ ہے جو مستقبل میں لوگوں کو اس معصیت سے دور رکھنے کے لئے اختیار کی جاتی ہے اس سے فی الحال کوئی منکر ختم نہیں ہوتا، ایسے انتظامی امور کا اختیار اگر معاشرے کے ہر ہر فرد کو دی جائے تو حد درجہ اضطراب اور افراتفری پھیل جائے گی اور اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لئے یہی تعزیر کا جامہ اوڑنا شروع کریں گے اس لئے اس کا اصل اختیار حکومت ہی کے پاس ہے، عوام کو از خود ایسے موقع پر تعزیر دینے کا اختیار نہیں ہوگا۔

(ويقيمه كل مسلم حال مباشرة المعصية) قنية (و) أما (بعده) ف (ليس ذلك لغير الحاكم) والزوج والمولى.

وفي حاشية ابن عابدين تحته:

(قوله ويقيمه إلخ) أي التعزير الواجب حقا لله تعالى؛ لأنه من باب إزالة المنكر، والشارع ولى كل أحد ذلك حيث قال – صلى الله عليه وسلم – «من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه» الحديث، بخلاف الحدود لم يثبت توليتها إلا للولاة، وبخلاف التعزير الذي يجب حقا للعبد بالقذف ونحوه فإنه لتوقفه على الدعوى لا يقيمه إلا الحاكم إلا أن يحكما فيه.

اهـ. فتح...(قوله وأما بعده إلخ) تصريح بالمفهوم. قال في القنية؛ لأنه لو عزره حال كونه مشغولا بالفاحشة فله ذلك؛ لأنه نهي عن المنكر وكل واحد مأمور به، وبعد الفراغ ليس بنهي؛ لأن النهي عما مضى لا يتصور فيتمحص تعزيرا، وذلك إلى الإمام. اهـ. وذكر قبله أن للمحتسب أن يعزر المعزر إن عزره بعد الفراغ منها.[1]

ترجمہ:" معصیت کے ارتکاب کے دوران اگر کوئی پکڑا گیا تو اس تعزیر کو ہر مسلمان جاری کر سکتا ہے،اور معصیت کے ارتکاب کے بعد پکڑا گیا تو حاکم،شوہر اور آقا کے علاوہ اور کوئی جاری نہیں کر سکتا"۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ اس عبارت تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کہ مصنفؒ کے قول"ویقیمہ"میں ضمیر کا مرجع تعزیر ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ تعزیر جو اللہ تعالی کا حق ہو کر ثابت ہو کیونکہ یہ منکرات کے لئے سد باب کا ذریعہ ہے اور شارع نے ہر ایک کو اس کا ذمہ دار بنایا ہے،جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: تم میں سے جو بھی منکرات کو دیکھ لے اس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس کو بازو کی قوت سے روکنے کی کوشش کرے،اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے(حدیث)،بر خلاف حدود کہ اس کو جاری کرنا صرف حکام کی ذمہ داری ہے اور اسی طرح وہ تعزیر جو بندے کا حق ہو کر ثابت ہو مثلا تہمت یا اس جیسی وجوہات سے لازم ہو کیونکہ یہ دعوی پر موقوف ہونے کی وجہ سے اس کو جاری کرنے کا حق صرف حاکم کو ہے،ہاں اگر حاکم کی

---

[1] الدر المختارمع حاشية ابن عابدين،باب التعزير،ج٤ص٦٥.

طرف مسئلہ اٹھانے سے پہلے پہلے دونوں آپس میں فیصلہ کرلے (تو حاکم تعزیری سزا نہیں دے گا، فتح القدیر)۔ معصیت کے ارتکاب کے دوران اگر کوئی پکڑا جائے تو تعزیر جاری کرنے کا حق عام مسلمان کو بھی ہے کہ یہ نہی المنکر میں داخل ہے اور ہر ایک مسلمان اس کا مکلف ہے،اور معصیت سے فراغت کے بعد یہ نہی نہیں، کیونکہ گزشتہ کام میں نہی کا تصور نہیں کیا جاسکتا تو یہ محض تعزیر ہوگی جو کہ امام وقت کا کام ہے،اور اسی کتاب میں اس عبارت سے پہلے یہ بھی ہے کہ اگر کسی عام شخص نے معصیت سے فراغت کے بعد کسی کو تعزیری سزا دی تو نگران اس شخص کو تعزیر دے سکتا ہے"۔

کس جرم پر تعزیری سزا دی جائے؟

تعزیر ہر اس گناہ پر مشروع ہے جس میں شریعت کی طرف سے کوئی مخصوص حد مقرر نہ ہو، جن منکرات پر شرعاً کوئی حد مقرر ہو وہاں متعلقہ حد ہی نافذ کیا جائے گا۔اصل ضابطہ تو یہی ہے، البتہ بعض اوقات حقیقت میں تو کوئی معصیت واقع نہیں ہوتی لیکن معصیت کی صورت کا ارتکاب کیا جاتا ہے پھر بھی تعزیر دی جاتی ہے مثلاً نابالغ یا غیر مکلف شخص کوئی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے عقل مند آدمی کو تعزیری سزا دی جاتی ہے تو اگر مصلحت ہو تو اس نابالغ اور غیر مکلف کو بھی تعزیری سزا دی جائے گی حالانکہ ایسے لوگوں کے کام کو اصل معنیٰ میں معصیت نہیں قرار دیا جاسکتا۔

قرائن کی بنیاد پر تعزیر

اسی طرح بعض اوقات ابھی معصیت کا تحقق نہیں ہوتا لیکن کچھ قرائن کی وجہ سے قوی خدشہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں اس کا ارتکاب ہوگا یا کوئی موجب فتنہ اقدام ہوگا تو جس شخص کے متعلق حاکم کو دیانت داری کے ساتھ ایسا اندیشہ ہو اس کو بھی وقت و مصلحت کے مطابق

کوئی تعزیری سزادی جاسکتی ہے، حضرت عمر فاروق اور بعض دیگر سلف صالحین (رضی اللہ تعالی عنہم) کے ہاں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو ایسے ہی خدشات کی وجہ سے جلاوطن فرمایاتھا۔"در مختار"اور"شامی"میں ہے:

(وعزر كل مرتكب منكر أو مؤذي مسلم بغير حق بقول أو فعل) إلا إذا كان الكذب ظاهرا كيا كلب بحر (ولو بغمز العين) أو إشارة اليد لأنه غيبة كما يأتي في الحظر، فمرتكبه مرتكب محرم وكل مرتكب معصية لا حد فيها، فيها التعزير أشباه.

وفي حاشية ابن عابدين تحته:

(قوله وعزر كل مرتكب منكر إلخ) هذا هو الأصل في وجوب التعزير.. وظاهره أن المراد حصر أسباب التعزير فيما ذكر مع أنه قد يكون بدون معصية كتعزير الصبي والمتهم كما يأتي وكنفي من خيف منه فتنة بجماله مثلا، كما مر في نفي عمر - رضي الله تعالى عنه - نصر بن حجاج.[1]

ترجمہ:" معصیت کاارتکاب کرنے والے ہر شخص کو تعزیری سزادی جائے گی ،بلاوجہ کسی مسلمان کو قول یا فعل سے تکلیف دینے والے کو،ہاں اگر اس کا جھوٹا ہوناظاہر ہو(تو پھر تعزیری سزانہیں دی جائے گی) مثلاکوئی کسی سے کہے:اے

---

[1] الدر المختارمع حاشية ابن عابدين،باب التعزير،ج٤ص٦٦.

کتےاگرچہ یہ تکلیف آنکھ یاہاتھ کے اشارے سے ہو کیونکہ یہ بھی غیبت میں داخل ہے جیساکہ حظرواباحت میں اس کی تفصیل آئے گی،توغیبت کرنے والا معصیت کا ارتکاب کرنے والاہوگا،اور ہر معصیت میں حد جاری نہیں ہوتی تواس صورت میں تعزیر ہوگی(اشباہ)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ اس عبارت تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ مصنفؒ کا قول "وعزر کل مرتکب منکر" یہ وجوب تعزیر کااصل وضابطہ ہے اور ظاہری عبارت سے یہ معلوم ہوتاہے کہ تعزیر کے اسباب انہی میں منحصر ہے حالانکہ کبھی کبھی بغیر معصیت کے بھی تعزیر دی جاتی ہے، مثلا: بچےاور متہم کو تعزیری سزادینا جیساکہ آگے تفصیل آئیگی،اور مثلا: اس شخص کو جلاوطن کرنا جس کے حسن صورت کی وجہ سے فتنے کا خطرہ ہو، جیسے: حضرت عمرؓ نے نصر بن حجاج کو جلاوطن کیا تھا"۔

قتل اور تعزیر کے دیگر مختلف درجات

یوں تو تعزیری سزا کی کوئی خاص شکل مقرر نہیں ہے نہ ہی حدود کی طرح اس کی کوئی خاص مقدار وتعداد شارع کا مقصود ہے، تعزیر کی ہزروں شکلیں ہوسکتی ہیں، کسی کے حق میں قاضی کے سامنے پیش کرناہی تعزیر کے لئے کافی ہےاسی طرح قاضی کا پوچھ گچھ کرنا، ماتھا چڑھانا، ترش کلامی کرنا بھی بعض شریف افراد کے حق میں تعزیر کے لئے کفایت کرجاتے ہیں جبکہ بعض لوگوں مزاج ومذاق کے لحاظ سے ایسے واقع ہوتے ہیں کہ مارے اور پٹائی کے بغیر ان کے حق میں تعزیر پوری نہیں ہوتی، پھر مارنے کی نوعیت کیا ہو؟ کس چیز سے مارا جائےاوراس کی مقدار کیا ہو؟اس لحاظ سے بھی بیسیوں صورتیں ممکن ہیں اور قاضی وحاکم کواختیار ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صورت مناسب سمجھے تو جاری کرے۔

اس لئے تعزیر کی کوئی خاص شکل یا مقدار تو متعین نہیں ہے البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حاکم یا دیگر افراد چاہے تو کسی بھی جرم پر کوئی بھی تعزیر جاری کریں یا چاہے تو کسی بھی گناہ و منکر کے مرتکب کو قتل کریں اور اس کو تعزیر کا نام دیں، مثلاً اگر کوئی مسلمان داڑھی کاٹتا ہے تو یہ یقیناً معصیت اور گناہ ہے لیکن حاکم، قاضی یا عام مسلمانوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ محض اس گناہ کی وجہ سے اقامتِ تعزیر کے جذبہ سے ایسے شخص کو جان سے ماریں، بلکہ تعزیر کی مختلف صورتوں اور متفاوت مراتب میں سے اسی صورت کو اختیار کرنا ضروری ہے جو اس جرم، ارتکاب کرنے والے مجرم اور وہاں کے ماحول کے ساتھ مناسب اور قرینِ مصلحت ہو، اگر تعزیر کے کسی اہون صورت کو اختیار کرنے سے مقصود پورا ہو جاتا ہے تو بلا وجہ اس سے شدید صورت کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہے۔

تعزیری قتل کی دو صورتیں

اسی طرح تعزیر کے طور پر قتل کرنے کی سزا بھی ہر جرم میں نہیں دی جاسکتی، بلکہ یہ سزا انہی جرائم میں دی جاسکتی ہے جن میں یا تو شریعت کی طرف سے کسی کو قتل کرنے کی اجازت ہے یا صراحت کے ساتھ اس کی اجازت تو نہ ہو لیکن جرم ایسا ہو جس کا مفسدہ ان جرائم کے مساوی یا بڑھ کر ہوں جن میں شریعت کی طرف سے قتل کرنے کا حکم موجود ہو اور اس میں مختلف درجات و مراتب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اگر قتل کے علاوہ کسی اقدام کے ساتھ روک تھام ممکن ہو تو اسی کو اختیار کرنا ضروری ہے اور اس کے ہوتے ہوئے بلا وجہ قتل کرنے کی جرات کرنا درست نہیں ہے اور اگر کہیں قتل کرنے میں ہی مصلحت ہو اور پوری دیانت داری کے ساتھ اس بات پر اطمینان ہو تو ایسی صورت میں قتل کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

اب زنا، جان ومال یا عزت کا تحفظ،ڈاکہ ڈالنا، مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانا، بندوق اٹھانا، سحر کرنا، وغیرہ ان جرائم میں سے ہیں جن کی بناء پر مختلف نصوص میں قتل کرنے کا حکم دیا گیا، لیکن معاشرے میں لوگوں کو ناحق طور پر نقصان پہنچانا، چوری کرنا، مختلف فتنوں اور بدعات کو ہوا دینا، کسی مردہ عورت سے اپنی شہوت پوری کرنا وغیرہ ایسے جرائم ہیں جن کی وجہ سے فقہی کتابوں میں قتل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور بظاہر یہ منصوص نہیں ہے لیکن اس کا ضرر اور مفسدہ ان سابقہ جرائم سے کچھ زیادہ کم نہیں ہے جن کی وجہ سے نصوص میں قتل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اس لئے حضرات فقہائے کرام نے مشروط طور پر ان جرائم کی وجہ سے قتل کرنے کی گنجائش دی۔

جرم تعزیری کو معاف کرنا

کسی جرم پر اقامتِ تعزیر کا اختیار اصلاً حاکم کو ہے، اس بات سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حاکم کی مرضی ہے کہ وہ چاہے تو کسی جرم پر تعزیری سزا دیدے اور چاہے تو معطل کرے، چنانچہ آج کل منکرات کا ایک طوفان ہے لیکن کسی بھی حکومت کی طرف سے اس پر مستقل تعزیر دینے کا ضابطہ مقرر نہیں ہے اور اس کو کوئی خاص قابل اعتراض بات نہیں سمجھا جاتا بلکہ عملی طور پر یہی تصور کیا جاتا ہے کہ حاکم کو اختیار ہے اور اس نے اپنے اختیار سے اس کو نافذ نہیں کرنا چاہتا تو اس میں اشکال کی بات کیا ہے؟ حالانکہ یہ سراسر غلط فہمی ہے، تعزیر قائم کرنے کے باب میں حاکم کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ چاہے تو تعزیر نافذ کرے اور چاہے تو اس کو بالکل معطل کردے بلکہ فی الجملہ شرعی منکرات پر تعزیر دینے کا نظم قائم کرنا اس کی ذمہ داری اور فرضِ منصبی ہے۔ البتہ کس جرم پر تعزیر کی کونسی شکل اختیار کرے؟ اگر مارنا ہی قرینِ مصلحت ہے تو کیسے اور کتنی بار؟ اس حد تک اس کو اختیار ہے

اور یہ اختیار بھی ذاتی اغراض ومفاد کے لئے نہیں ہوتا کہ جہاں جو چاہے کرے، بلکہ تعزیر کی ان تمام اشکال وانواع میں وہ مصلحت تلاش کرنے کا پابند ہو کہ ان میں سے جو صورت اس کو مناسب معلوم ہو اسی کو جاری کرے۔

لہٰذا منکرات پر تعزیر دینے کو بالکل معطل کرنا حاکم اور قاضی کے دائرہ اختیار سے باہر ہے، تعزیر کے باب میں حاکم و قاضی کے اختیار و تفویض سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ چاہے تو تعزیر کے باب کو بالکل معطل کردے، البتہ تعزیر کی کسی خاص شکل کو قائم کرنا اس کے لئے ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں قرینِ مصلحت صورت کو اپنانے کا پابند ہے۔

"منحۃ الخالق" میں ہے:

(قوله: فهذا كله يدل على أن العفو للإمام جائز) قد يقال عليه: إن المقصد من شرعية التعزير هو الانزجار فعفو الإمام عنه تضييع للمقصود فلا يجوز فالمراد أن له العفو إذا رأى حصول الانزجار بدونه فلذا قال في الفتح إلا إذا علم أنه انزجر الفاعل قبل ذلك ويدل عليه أيضا من أنه إذا كان الشاتم ذا مروءة وعظ، وقد علمت أن ذلك لحصول الانزجار من ذي المروءة فهذا في الشتم الذي هو حق عبد واكتفى فيه بالوعظ فكيف في حق الله تعالى وذكر في الفتح أول الباب أن ما نص عليه من التعزير كما في وطء جارية امرأته أو جارية مشتركة يجب امتثال الأمر فيه وما لم ينص عليه إذا رأى الإمام

المصلحة بعد مجانبة هوى نفسه أو علم أنه لا ينزجر إلا به وجب؛ لأنه زاجر مشروع لحق الله تعالى فوجب كالحد وما علم أنه انزجر بدونه لا يجب.[1]

ترجمہ: تعزیر کے مشروع ہونے کا مقصد جرائم سے لوگوں کو روکنا ہے اور امام کو معافی کا اختیار دینا اس مقصد کے منافی ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اگر امام سمجھتا ہو کہ تعزیر کے بغیر بھی تنبیہ ہو سکتی ہے تو تعزیری سزا دینا ضروری نہیں، اسی وجہ سے "فتح القدیر" میں ہے کہ اگر امام سمجھتا ہو کہ تعزیر کے بغیر بھی فاعل کو تنبیہ ہو سکتی ہے تعزیر سے پہلے تو تعزیری سزا دینا ضروری نہیں، اسی پر یہ مسئلہ بھی دلالت کرتا ہے کہ شاتم اگر لوگوں کی نظروں میں معزز شخص ہو تو صرف وعظ و نصیحت سے اسے سمجھایا جائے گا، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ معزز شخص کو صرف وعظ و نصیحت سے تنبیہ ہو جاتی ہے، اور جب سب و شتم میں تعزیر کا یہ حکم ہے جو کہ حقوق العباد میں سے ہے تو حقوق اللہ میں بطریق اولی ہو گا اور "فتح القدیر" کے باب اول میں ہے کہ: جو تعزیر منصوص علیہ ہو اس میں امتثال امر ضروری ہے جیسا کہ اپنی بیوی کی یا مشترکہ باندھی سے وطی کرنا اور جو تعزیر غیر منصوص علیہ ہو اس میں جو امام سوچ و بچار کے بعد جو بھی تعزیری سزا دینا مناسب سمجھے وہی تعزیر ہی واجب و ضروی ہے کیونکہ یہ ایسا زجر ہے جو اللہ تعالی کے حق کے لئے ہے تو یہ بھی حد کی طرح واجب ہے، اور جہاں معلوم ہو کہ تعزیر کے بغیر تنبیہ ہو سکتی ہے تو تعزیر واجب نہیں"۔

---

[1] منحة الخالق على البحر الرائق،كتاب الحدود،فصل في التعزير،ج٥ص٤٩.

تعزیر سے متعلق باتوں کا خلاصہ

تعزیر سے متعلق جو باتیں ابھی تک مذکور ہوئی، ان کا حاصل یہ ہے کہ:

الف: تعزیر ان معاصی و جرائم کے ارتکاب پر دی جاتی ہے جس میں شریعت کی طرف سے کوئی حد متعین نہیں ہوتا۔

ب: تعزیر کی کوئی خاص شکل ہر حال میں ضروری نہیں ہے بلکہ حاکمِ وقت کی صوابدید پر مبنی ہے کہ وہ جس شکل کو زیادہ مناسب اور قرینِ مصلحت سمجھے اسی کو اختیار کرے۔

ج: حاکم کو بھی بلاوجہ تعزیر معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے جبکہ شرعی مصلحت کا تقاضا نہ ہو۔

د: عوام کو عین معصیت کے وقت تو تعزیر دینے کی کسی حد تک اجازت ہے لیکن معصیت کے بعد سابقہ معصیت پر تعزیر دینا عوام کا کام نہیں ہے۔

ر: تعزیر کے مختلف درجات و مراتب میں سے ترتیب وتدریج کا لحاظ ضروری ہے، اگر کم درجہ کے مار پٹائی سے مصلحت پوری ہوتی ہے تو زیادہ مارنا، قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

ان باتوں کی تنقیح کے بعد اب ان صورتوں کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے جہاں تعزیری طور پر مسلمان کو قتل کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور ساتھ اس کے حدود و قیود بھی بیان کئے جاتے ہیں۔

تعزیری کی بناء پر قتل کی بعض صورتیں

پہلی صورت: چور کو قتل کرنا

اگر کوئی شخص دوسرے کو دیکھے کہ اس کا مال چوری کر رہا ہے تو اولاً اس کو آواز دیکر بھگانے کی کوشش کرے یا دیگر کسی طریقے سے ڈراؤ دھمکاؤ کر کے دفع کرنے کی

کوشش کرے، اگر کسی بھی طرح وہ نہ بھاگے بلکہ بہر حال وہ چوری کرنے پر ہی اصرار کرے تو اس صورت میں تعزیر کے طور پر اس کو قتل کرنے کی گنجائش ہے لیکن چونکہ تعزیر کے مختلف سزاؤں میں تدریج و ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اس لئے قتل کو بالکل آخری درجہ میں جا کر اختیار کرے جہاں اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہو جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سیدھا چور کو گولی مارنے کے بجائے ہوائی فائرنگ کی جائے۔ "فتاویٰ قاضی خان" میں ہے:

رجل رأى رجلا يزني بامرأته أو بامرأة رجل آخر و هو محصن فصاح به فلم يهرب و لم يمتنع عن الزنا حل لهذا الرجل قتله فإن قتله لا قصاص عليه * و كذلك رجل رأى رجلا يسرق ماله فصاح به فلم يهرب أو رأى رجلا ينقب حائطه أو حائط غيره و هو معروف بالسرقة فصاح به و لم يهرب حل له قتله و لا قصاص عليه * وكذلك الرجل يقتل قاطع الطريق حل قتله و لا قصاص عليه.[1]

ترجمہ: "اگر کسی نے اپنی بیوی یا کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ کسی ایسے شخص کو زنا کرتے ہوئے دیکھا جو محصن تھا تو اس نے چیخ و پکار کے ذریعہ اس کو بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں بھاگا اور زنا سے منع بھی نہیں ہوا تو اس کو قتل کرنا حلال ہے اور قتل کی صورت میں قصاص بھی نہیں ہوگا، اسی طرح کسی نے کسی

---

[1] فتاوى قاضيخان،باب القتل،فصل فيمن يقتل قصاصا و فيمن لا يقتل،ج۳ص۲۷۰.

کو دیکھا کہ اس کا مال چوری کر رہا تھا تو اس نے چیخ وپکار کے ذریعہ اس کو بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں بھاگا، یا کسی کو دیکھا کہ وہ اس کی دیوار یا کسی اور کی دیوار میں نقب لگا رہا تھا اور وہ لوگوں کے درمیان چور مشہور تھا تو اس نے چیخ وپکار کے ذریعہ اس کو بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں بھاگا، تو اس کو قتل کرنا حلال ہے اور قتل کی صورت میں قصاص نہیں ہوگا، اور اسی طرح ڈاکو کو قتل کرنا حلال ہے اور قاتل پر قصاص نہیں ہوگا"۔

"شرح نقایہ" میں ہے:

لو دخل عليه لصٌّ لَيلاً فأخرج قَدْر عشرة دراهم فصاح عليه وأَنشده الله والإسلام فلم يتركه فقتله هُدِرَ دمُهُ لما تقدّم، ولما في «صحيح مسلم» عن أبي هريرة، قال: جاء رجلٌ إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله أرأيت إن جاء رجلٌ يريد أن يأخذ مالي؟ قال: «فلا تُعْطِه مالك». قال: أرأيت إن قاتلني؟ قال: «قاتله». قال: أرأيت إن قتلني؟ قال: «فأنت شهيد». قال: أرأيت إن قتلته؟ قال: «فهو في النار».[1]

ترجمہ: "اگر رات کو کسی کے گھر چور داخل ہو کر دس (۱۰) دراہم کی مالیت کے بقدر مال لے کر نکلنے لگا تھا تو مالک نے چیخ وپکار شروع کی اور اللہ تعالی واسلام کا واسطہ دیا لیکن وہ باز نہیں آیا، تو مالک نے اسے قتل کر دیا تو چور کا خون معاف ہے

[1] فتح باب العناية بشرح النقاية، كتاب الجنايات، ج٦ ص١٦٨.

اور اس کی وجہ گزر چکی، اور اس حدیث کی وجہ سے بھی جو "صحیح مسلم" میں ہے: حضرت ابوہریرۃؓ فرماتے ہے ایک مرتبہ آپ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور مسئلہ پوچھا کہ اگر کوئی مجھ سے میرا مال زبردستی لینے کے کوشش کرے تو میرے لئے کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو اپنا مال نہ دینا، سائل نے پوچھا کہ اگر وہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو بھی اسے قتل کر سکتا ہے، سائل نے پوچھا کہ اگر وہ مجھے قتل کر ڈالے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو شہید ہوگا، سائل نے پوچھا کہ اگر میں اسے قتل کر ڈالوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا"۔

چور مشہور ہونے اور دس درہم چوری کرنے کی قید

یہاں پہلی عبارت میں یہ قید لگی ہے کہ ""یعنی دیوار میں نقب لگانے والے کو تبھی قتل کرنا جائز ہے جبکہ نقب لگانے والے شخص کا چور ہونا مشہور ہو، لیکن یہ کوئی قید احترازی نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس کا چور ہونا اور چوری کی نیت سے ایسا اقدام کرنا مظنون یا متیقن ہو، لہٰذا اگر کوئی شخص پہلے سے چور نہ ہو بلکہ پہلی مرتبہ چوری کا ارادہ کرتے ہوئے ایسا اقدام کرے تو بھی اس کا یہی حکم ہوگا کہ اگر کسی دوسری تدبیر سے وہ باز نہ آئے تو قتل کرنا جائز ہے۔

اسی طرح "شرحِ نقایہ" کی دوسری عبارت اور بعض دیگر کتابوں میں یہاں یہ قید ذکر کی گئی ہے کہ کم از کم دس درہم (دو تولہ ساڑھے سات ماشہ) کی مالیت کی چوری کر رہا ہو، لیکن یہ بھی کوئی ضروری قید نہیں ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ دس درہم کی مقدار تو حد سرقہ قائم کرنے کے لئے ضروری ہے جبکہ یہ قتل بطور حد نہیں ہے، یہ تو مال کے دفاع کے لئے قتل کیا جارہا ہے جس کی متعدد احادیث میں اجازت دی گئی ہے جن میں سے ایک

روایت درجِ بالا عبارت میں موجود ہے،اور ظاہر ہے کہ ان احادیث میں کسی خاص مالیت کا ذکر نہیں ہے کہ اگراتنی مالیت کی چیز چوری کررہا ہو تو اس کو قتل کرنا جائز ہے ورنہ نہیں، لٰہذا اس کو بھی قیدِ احترازی اور قیدِ لازم کے طور پر نہیں سمجھنا چاہئے،ہاں یہ درست ہے کہ معمولی مالیت کو بچانے کے لئے کسی مسلمان کی جان تلف کرنے سے بہتر یہی ہے کہ مالک اس کو دل سے معاف ہی کرے اور قتل کرنے کا اقدام نہ کرے۔

اور "تبیین الحقائق" میں ہے:

(ومن دخل عليه غيره ليلا فأخرج السرقة فاتبعه فقتله فلا شيء عليه) لقوله – عليه الصلاة والسلام – «قاتل دون مالك» أي لأجل مالك؛ ولأن له أن يمنعه بالقتل ابتداء فكذا له أن يسترده به انتهاء إذا لم يقدر على أخذه منه إلا به، ولو علم أنه لو صاح عليه يطرح ماله فقتله مع ذلك يجب القصاص عليه؛ لأنه قتله بغير حق، وهو بمنزلة المغصوب منه إذا قتل الغاصب حيث يجب عليه القصاص؛ لأنه يقدر على دفعه بالاستعانة بالمسلمين والقاضي فلا تسقط عصمته بخلاف السارق والذي لا يندفع بالصياح والله سبحانه وتعالى أعلم[1]

---

[1] تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق وحاشية الشلبي ،٦/ ١١١)

ترجمہ:"اگر رات کو کوئی کسی کے گھر چوری کے ارادے سے داخل ہو جائے اور مال چوری کر کے نکلنے لگے اور مالک اس کا پیچھا کر کے قتل کر ڈالے تو قاتل پر آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے قصاص نہیں:" تو اپنے مال کی حفاظت کے لئے قتل بھی کر سکتا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ جب انسان ابتداءً اپنے مال کی حفاظت کے لئے قتل کر سکتا ہے تو انتہاءً بھی کر سکتا ہے اگر اس قتل کے علاوہ اور کوئی صورت نہ ہو، اور اگر مالک کو معلوم ہو کہ چیخ و پکار سے چور مال چھوڑ بھاگ جائے گا اور پھر بھی قتل کیا تو ناحق قتل کی وجہ سے تو قصاص لازم ہوگا، اور یہ اس مغصوب منہ کی طرح ہے جو غاصب کو قتل کر ڈالے تو اس سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ یہاں مسلمانوں اور قاضی کے تعاون سے قتل کے بغیر بھی اپنا دفاع ممکن تھا، لہذا غاصب کی عصمت ساقط نہیں ہوگی پر خلاف چور اور اس صورت کے جہاں چیخ و پکار سے اپنا دفاع ممکن نہ ہو، واللہ اعلم "۔

دوسری اور تیسری صورت:

جان و عزت پر حملہ آور کو قتل کرنا

اسی طرح اگر کوئی شخص دوسرے کے جان، مال یا عزت پر حملہ کرے تو بھی جس پر حملہ ہو رہا ہے اس کو اپنے دفاع کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے بلکہ جان و عزت پر حملہ کرنے کی صورت میں اس کے لئے ضروری ہے کہ حملے کو ناکام بنانے میں اپنی بساط بھر کوشش کرے اور حملہ آور شخص کو کسی ناجائز اقدام کا کسی طرح موقع نہ دے اور مال اگر ذاتی و مملوک ہو تو اس پر ہونے والے حملہ کا دفاع کرنا لازم نہیں ،اگر دفاع میں ڈراؤ ودھمکاؤ، مار پیٹ کی ضرورت درپیش ہو تو بھی مضائقہ نہیں ہے، اگر ان تدابیر سے کام نہ

چلے اور قتل کئے بغیر دفاع کی کوئی اور صورت مفید نہ رہے تو ایسی صورت میں قتل کرنے کی بھی گنجائش ہے، اس میں قتل کرنے والے پر بھی ان شاءاللہ کوئی گناہ نہیں ہو گا بلکہ اگر اس طرح دفاع کرتے ہوئے اس کو قتل کیا گیا تو شہید ہو گا۔

سنن ابی داؤد کی روایت ہے:

عن سعيد بن زيدٍ، عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: "مَنْ. قُتِلَ دونَ ماله فهو شهيد، ومَنْ قُتِلَ دون أهلِه أو دون دَمِه أو دون دِينِه فهو شهيدٌ".[1]

ترجمہ: "حضرت سعید بن زیدؓ نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ: جو شخص اپنے مال کی حفاظت یا اپنی بیوی کی عزت کی حفاظت یا اپنے نفس کی حفاظت یا دین کے لئے قتل کیا گیا تو وہ شہید ہے"۔

"محیط" میں ہیں:

وكذلك من قتل مدافعاً عن نفسه، أو ماله، أو أهله، فهو شهيد قال عليه السلام: «من قتل دون ماله فهو شهيد» ؛ ولأنه في معنى شهداء أُحد.[2]

ترجمہ: "اسی طرح جو شخص اپنے نفس، مال یا اپنے اہل کی دفاع کرتے ہوئے قتل کیا جائے تو وہ شہید ہے، آپ ﷺ کا فرمان عالی ہے: جو دین کے لئے قتل کیا گیا تو وہ شہید ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ یہ شہداء احد کے معنی میں ہے"۔

---

[1] سنن أبي داود ت الأرنؤوط، كتاب السنة، باب في قتال اللُّصوص، ج٧ص١٥١.

[2] المحيط البرهاني في الفقه النعماني، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ج٢ص١٦١.

"شرح النقایۃ" میں ہے:

ولو أراد رجلٌ أن يأخذ مال مسلمٍ، أو يقطع عُضْوه، أو يزني بامرأته، فله دَفْعُه بغير السيف، فإن لم يندفع فيضربه بالسيف. وكذا لو رأى رجلاً يزني بامرأته: يدفعه بغير السيف، فإن لم يندفع فيقتله، ولا خلاف لأهل العلم فيه لقوله عليه الصلاة والسلام: «من قُتِل دون ماله فهو شهيدٌ، ومن قُتِل دون دينه فهو شهيدٌ، ومن قُتِل دون دمه فهو شهيدٌ، ومن قُتِل دون أهله فهو شهيدٌ». رواه أحمد والترمذي والنَّسائي وابن حِبَّان في «صحيحه».[1]

ترجمہ: "اگر کوئی شخص کسی مسلمان کا زبردستی مال لینے یا عضو کاٹنے کی کوشش کرے یا اس کی بیوی سے زنا کرے تو اسے چاہیے کہ پہلے بغیر تلوار کے منع کرے، اگر پھر بھی منع نہ ہو تو تلوار کے ذریعہ سے اپنا دفاع کرے، اس طرح اگر کسی نے دیکھا کہ کوئی اس کی بیوی سے زنا کر رہا ہے تو اس چاہیے کہ پہلے اسے بغیر تلوار کے منع کرے اگر پھر بھی باز نہ آئے تو تلوار کے ذریعہ سے منع کرے، اس میں اہل علم میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں، آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ: جو شخص اپنے مال کی حفاظت یا دین کے لئے یا اپنے نفس کی حفاظت یا اپنی بیوی کی عزت کی حفاظت کے لئے قتل کیا گیا تو وہ شہید

---

[1] فتح باب العناية بشرح النقاية، كتاب الإكراه، ج٦ ص١٦٨.

ہے، اس حدیث کو امام احمدؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائی اور ابن حبانؒ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل فرمایا ہے"۔

عزت کی بچاؤ کے لئے خودکشی کرنا

اگر کوئی شخص کسی مسلمان عورت کی عزت پر حملہ آور ہو جائے اور عورت اپنی پوری کوشش صرف کرنے کے باوجود بھی اپنا دفاع کر سکتی ہو نہ ہی اس ظالم حملہ آور کو قتل کر سکتی ہو تو ایسی صورت میں کیا اس عورت کے لئے اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ عزت کی بچاؤ کی خاطر خودکشی کر کے اس کے حملے کو ناکام ثابت کرے یا نہیں؟ اگر عورت کے بجائے مرد پر اس طرح جبر واکراہ کیا جائے کہ وہ زنا کرے ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا تو کیا اس صورت میں مرد مجبوری کی وجہ سے زنا کا اقدام کر سکتا ہے یا نہیں؟ نیز ان دونوں صورتوں میں بعض اوقات ایسا بھی کیا جاتا ہے کہ اس مجبور مرد/عورت کا کوئی عزیز وقریب اپنی اور اپنی خاندان کی عزت وعار بچانے کے لئے اس کو قتل کر دیتا ہے اور بعض مجبور ومکرہ شخص خود فرمائش کرتا ہے کہ عزت لوٹنے کا خدشہ قوی ہو تو مجھے اپنے ہی ہاتھ سے قتل کرنا، ان تمام صورتوں میں عزت کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو قتل کرنا یا دوسرے مسلمان قریب وعزیز کو اس کی خواہش یا اس کے بغیر قتل کرنے کا کیا حکم ہے؟ کیا شرعاً اس کی اجازت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

مسئلہ سے متعلق چند فقہی عبارات

ان سوالات کے حتمی جوابات دینے سے پہلے چند فقہی عبارات ذکر کی جاتی ہیں اور پھر اس کی روشنی میں اصل حکم تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مبسوط میں ہے:

ولو قال له لأقتلنك، أو لتقتلن هذا المسلم عمدا، أو تزني بهذه المرأة لم يسعه أن يصنع واحدا منهما حتى يقتل، فإن صنع واحدا منهما، فهو آثم؛ لأن كل واحد من هذين الأمرين لا يحل له بالإكراه، وإن أكره عليه بعينه، فكذلك إذا أكره على أحدهما بغير عينه، فإن أبى أن يفعل واحدا منهما حتى قتل كان مأجورا لأنه بذل نفسه في التحرز عن الحرام، وقيل بالذي قتله؛ لأنه قتله ظلما، فعليه القود، وإن زنى كما أمره، ففي القياس عليه الحد، وفي الاستحسان عليه المهر ومن أصحابنا من قال المراد بالقياس في قول أبي حنيفة - رحمه الله - الأول، وبالاستحسان قوله الآخر كما بينا فيما إذا أكره على الزنا بعينه. والأصح أن هذا قياس واستحسان أجريناه على قوله الآخر: وجه القياس أنه إذا أقدم على قتل المسلم كان آلة في ذلك الفعل، وكان الفعل منسوبا إلى غيره، وهو المكره، فلا يكون هو مؤاخذا بشيء من أحكامه، وإذا أقدم على الزنا كان الفعل منسوبا إليه بحكمه، فهو للإقدام على الزنا هنا مع تمكنه من دفع البلاء عن نفسه على وجه لا يصير مؤاخذا بشيء من أحكام الفعل بأن يقتل الرجل فيلزمه الحد بخلاف ما لو أكره على الزنا

بعينه، ووجه الاستحسان أن في هـذه الحالـة لا يحـل لـه الإقدام على قتل المسلم، فهو أقدم على الزنا دفعا للقتـل عن غيره، ولو أقدم على الزنا دفعا للقتل عن نفسـه بـأن أكره عليه بعينه سقط عنه الحد ولزمه المهر، فهذا مثله.

يوضحه أن الضرورة تحققت له في كل واحد من هـذين الفعلين حين لم يسعه الإقدام على واحد مـنهما، فيجعـل في حق كل واحد منهما كأنه أكره عليه بعينه حتى لو قتل المسلم كان القـود عـلى المكـره، وكـان المكـره مسـتحقا للتعزير، والحبس بمنزلة ما لو أكره عليه بعينه، فلـذلك إذا أقدم على الزنا كان عليه الصداق، وهـذا عنـد الحـد بمنزلة ما لو أكرهه عليه بعينه.[1]

ترجمہ: "اگر کسی شخص نے کسی سے کہا کہ میں تجھے قتل کرونگا اگر تو اس مسلمان کو عمداً قتل نہیں کریگا یا اس عورت سے زنا نہیں کریگا تو مکرَہ کے لئے اس میں سے کوئی کام بھی جائز نہیں اگرچہ قتل کر دیا جائے۔ اگر اس میں سے کسی بھی کام کا ارتکاب کیا تو گنہگار ہوگا، کیونکہ اس میں سے کوئی کام بھی اکراہ کی وجہ سے مباح نہیں ہوتا، اگرچہ کسی ایک متعین کام پر اکراہ کرے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی غیر متعین کام پر اکراہ کرے پس اگر مکرَہ نے ان میں سے ہر ایک معصیت کے ارتکاب سے انکار کر دیا یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا تو عند اللہ ماجور

[1] المبسوط للسرخسي، كتاب الإكراه، ج٢٤ ص١٣٧.

ہو گا کیونکہ اس نے حرام سے بچنے کے لئے جان کی قربانی دے دی، اور قاتل نے چونکہ ناحق قتل کیا ہے اس وجہ سے اس سے قصاص لیا جائے گا، اور اگر اس نے زنا کا ارتکاب کیا تو قیاس کے مطابق زانی پر حد ہے اور استحسان کے مطابق مہر لازم ہو گا، اور ہمارے اصحاب احناف فرماتے ہیں کہ قیاس امام صاحبؒ کا قول اول تھا اور استحسان قول ثانی جیسا کہ ہم نے بیان کیا اس صورت میں کہ جب معین طور پر زنا پر اکراہ کیا جائے، اصح بات یہ ہے کہ یہ قیاس ہے اور استحسان کو ہم نے دوسرے قول میں جاری کیا ہے، قیاس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نے مسلمان کے قتل پر اقدام کیا تو یہ درمیان میں بمنزلہ آلہ کے ہوا اور فعل غیر کی طرف منسوب ہوا جو کہ مکرِہ ہے لہذا مکرَہ کا کسی طرح سے بھی مواخذہ نہیں ہو گا، اور جب اس نے زنا پر اقدام کیا تو فعل اپنے حکم کے ساتھ اس کی طرف منسوب ہو گا، تو یہاں زنا پر اقدام کیا گیا حالانکہ وہ اس بات پر قادر تھا کہ اپنے نفس سے مصیبت کو ایسے طریقہ سے دور کرتا کہ کسی صورت میں بھی اس کا مواخذہ نہ ہوتا بایطور کے وہ آدمی کو قتل کرتا، لہذا اس پر حد لازم ہو گی، بر خلاف اس صورت کے کہ جب معین طور پر زنا پر اکراہ کیا جائے، اور استحسان کی وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں اس کے لئے مسلمان کے قتل پر اقدام حلال نہیں تو اس نے زنا پر اقدام اس وجہ سے کیا تا کہ غیر کے قتل سے بچ جائے، اور اگر اس نے زنا پر اقدام اس وجہ سے کیا تا کہ اپنے آپ کو قتل سے بچالے بایطور کہ معین طور پر زنا پر اکراہ کیا گیا تو اس سے حد ساقط ہو گئی اور مہر لازم ہو جائے گا تو یہ اس کے مثل ہے، اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں ضرورت ثابت ہو گئی کہ جب اس کے لئے کسی ایک کام کرنے کی بھی گنجائش نہ رہی تو دونوں کے حق میں وہ ایسا سمجھا جائے گا گویا کہ اس پر کسی متعین معصیت

کے بارے میں اکراہ کیا گیا، اور قصاص مکرِہ پر ہوگا اور مکرَہ تعزیر و قید کرنے کا مستحق ہوگا، جیسا کہ کسی متعین معصیت کے بارے میں اکراہ کرنے کی صورت میں حکم ہے اسی وجہ سے جب اس نے زنا پر اقدام کیا تو اس پر مہر لازم ہوگا اور یہ حد کی صورت میں اس طرح ہے جس طرح متعین معصیت کے بارے میں اکراہ ہو"۔

"الاختیار" میں ہے:

قال: (ومن أكره على الزنا لا حد عليه) لوجود الشبهة ويأثم بالفعل، ولو صبر كان مأجورا كالقتل؛ لأن الزنا لا يباح بوجه ما. وقال أبو حنيفة أولا وهو قول زفر: يحد لأن انتشار الآلة دليل الطواعية. قلنا: وقد يكون طبعا والشبهة موجودة، ولو أكرهت المرأة وسعها ذلك ولا تأثم، نص عليه محمد؛ لأن الفاعل الرجل دونها؛ لأن الإيلاج فعله فلم يتحقق الزنا منها، لكن تمكينها وسيلة إلى فعله فيباح عند الضرورة ; ولو أمره ولم يكرهه في هذه المسائل كلها إلا أنه يخاف القتل إن لم يفعل فهو في حكم المكره لأن الإلجاء باعتبار الخوف، وقد تحقق.[1]

---

[1] الاختيار لتعليل المختار، كتاب الإكراه، ج ٢ ص ١٠٨.

ترجمہ: "مصنفؒ فرماتے ہیں جس پر زنا کے بارے میں اکراہ کیا گیا ہو اس پر شبہ کی وجہ سے حد جاری نہیں ہو گی لیکن فعل کی وجہ گنہگار ہو گا اور صبر کرنے کی صورت میں عند اللہ ماجور ہو گا کیونکہ زنا کسی صورت میں مباح نہیں ہوتا، اور امام صاحبؒ کا قول اول اور یہی قول امام زفرؒ کا بھی ہے کہ اس صورت میں حد جاری کی جائے گی کیونکہ نفسانی خواہش کا پیدا ہو نا رضامندی کی دلیل ہے، ہم اس کا جوب یہ دینگے کہ نفسانی خواہش کبھی محض طبعی طور پر بھی ہوتی ہے اور شبہ بھی یہاں موجود ہے، اور اگر کسی عورت پر زنا کے بارے میں اکراہ کیا گیا تو اس کے لئے اس کی گنجائش ہے اور گنہگار بھی نہیں ہو گی امام محمدؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے اس لئے کہ اس صورت میں فاعل تو مرد ہے نہ کہ عورت کیونکہ دخول تو مرد کی طرف سے ہے تو عورت کی طرف سے زنا نہیں پایا گیا لیکن زنا پر قدرت دینا مرد کے فعل کے لئے وسیلہ ہے تو ضرورت کے وقت یہ مباح ہو گا، اور اگر ان تمام صورتوں میں صرف حکم دیا گیا اور عُرفا اکراہ نہیں پایا گیا مگر نہ کرنے کی صورت میں قتل ہونے کا خطرہ تھا تو یہ بھی حکما اکراہ ہی ہے کیونکہ اکراہ ملجی کی علت خوف ہے جو کہ یہاں موجود ہے"۔

"تبیین" میں ہے:

وكذا لو أكره على الزنا لا يرخص له؛ لأن فيه قتل النفس بالضياع؛ لأنه يجيء منه ولد ليس له أب يربيه ولأن فيه إفساد الفراش بخلاف جانب المرأة حيث يرخص لها بالإكراه الملجئ؛ لأن نسب الولد لا ينقطع عنها فلم يكن في معنى القتل من جانبها بخلاف

الرجل، ولهذا أوجب الإكراه القاصر درء الحد في حقها دون الرجل.[1]

ترجمہ: "جس پر زنا کے بارے میں اکراہ کیا گیا ہو تو اس کے لئے یہ مباح نہیں ہو گا کیونکہ یہاں معنیٰ قتل موجود ہے اس لئے کہ اس کے نتیجے میں ایسا بچہ پیدا ہو گا جس کا تربیت کرنے والا باپ نہیں ہو گا، اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں نسب کے حوالے سے بھی خرابی موجود ہے، جبکہ عورت کے حق میں اکراہ ملح ی کی صورت میں اس کی گنجائش ہے کیونکہ بچے کا نسب اس سے منقطع نہیں ہوتا تو یہ مرد کی طرح معنیً قتل نہیں ہو گا اسی وجہ سے اکراہ قاصر کی وجہ سے عورت کے حق میں تو حد ساقط ہو جاتی ہے لیکن مرد کے حق میں ساقط نہیں ہوتی"۔

"تحفۃ الفقہاء" میں ہے:

ولو أكره على الزنا بالقتل لا يباح ولا يـرخص للرجـل ويرخص للمرأة وكان أبو حنيفة يقول أولا إنه لا يجـب الحد ثم رجع وقال فإن كـان الإكـراه مـن السـلطان لا يجب الحد ويجب العقر وإن كان مـن غـيره يجـب الحـد وعندهما لا يجب الحد ويجب العقر كيفما كان.[2]

ترجمہ: "اور اگر کسی پر زنا کے بارے میں قتل کا اکراہ کیا گیا تو اس کے لئے یہ مباح نہیں ہو گا اور مرد کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہو گی جبکہ عورت کے حق

---

[1] تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، ج٥ ص١٨٦.

[2] تحفة الفقهاء، كتاب الإكراه، ج٣ ص٢٧٥.

> میں اکراہ ملجی کی صورت میں اس کی گنجائش ہے اور امام صاحبؒ کا قول اول یہ تھا کہ اس صورت میں حد جاری کی جائے گی، لیکن پھر اس قول سے رجوع پر فرمایا اور یہ قول اختیار کیا کہ اگر اکراہ حاکم کی طرف سے ہو تو حد جاری نہیں ہو گی اور مہر لازم ہو گا اور کسی اور کی طرف سے ہو تو پھر حد جاری ہو گی، اور صاحبینؒ کے ہاں بہر صورت حد جاری نہیں ہو گی اور مہر لازم ہو گا"۔

عبارات سے حاصل ہونے والے فقہی فوائد

ان عبارات سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

الف: زنا ان حرام امور میں سے ایک ہے جن کی اکراہ کے وقت بھی کرنے گنجائش پیدا نہیں ہوتی، لہٰذا اگر کسی مرد پر اکراہ کیا گیا اور اکراہ بھی ملجی ہو جس میں جان یا اعضاء تلف ہو جانے کا قوی اندیشہ ہو تو اس وقت بھی اس کے لئے زنا پر آمادہ ہو جانا جائز نہیں ہے، اگر اس وقت بھی زنا کا اقدام کرے گا تو گناہ گار ہو گا اور اگر اس فعلِ بد کے نہ کرنے کی وجہ سے اس کو قتل کیا گیا تو ماجور (و شہید) ہو گا کہ ایک ناجائز سے رکنے کے پاداش میں اس کو ظلماً قتل کیا گیا۔

ب: امام محمد رحمہ اللہ کی ایک روایت کے مطابق اگر عورت پر اکراہ ملجی کیا جائے تو اس کے لئے مجبوری کے عالم میں گنجائش ہے۔

ج: زنا کے حرام ہونے کی دو بڑی وجوہات ہیں، ایک تو یہی کہ قرآن وسنت میں اس کو حرام کیا گیا اور دسیوں نصوص سے اس کا حرام ہونا واضح ہو جاتا ہے اس لئے اس فعل بد پر آمادہ ہونا ان نصوص کو عملی طور پر چھوڑنا ہے جس کا گناہ ہونا واضح ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ

بھی ہے کہ چونکہ جماع کے نتیجے میں بچہ پیدا ہونا ممکن ہے اور زانی سے بچے کا نسب ثابت نہیں ہوتا، اس لئے زنا کرنا انجامِ کار بچے کے قتل یا ضیاع کا سبب بن جاتا ہے۔

د: مرد کے حق میں اکراہ کے وقت بھی حرمت کی یہ دونوں وجوہات برابر قائم ہیں اس لئے اس کے لئے اکراہ کی صورت میں بھی اس فعلِ بد کے کرنے سے احتراز ہی کرنا ضروری ہے ورنہ گناہ گار ہوگا، جبکہ عورت کے حق میں معاملہ مختلف ہے، چنانچہ اس کے حق میں حرمت کی درج بالا دوسرے سبب کا نہ ہونا تو ظاہر ہے کہ ماں سے بہر حال بچے کا نسب ثابت ہوتا ہے اور وہ اس کی تربیت وپرورش کرے گی۔ جہاں تک پہلی وجہ ہے یعنی فعلِ زنا کا حرام ہونا، تو یہ وجہ بھی مرد ہی میں پوری طرح متحقق ہو جاتی ہے کیونکہ زنا "غیر منکوحہ وغیر مملوکہ عورت کے فرج میں ناجائز طور پر شرم گاہ داخل کرنے کا نام ہے" اور ظاہر ہے کہ یہ فعل مرد ہی کی طرف سے متحقق ہو سکتا ہے، اس میں عورت کا دخل اگر ہے تو یہی کہ وہ مرد کو اپنے اوپر قدرت دیدے، لہٰذا واقعی اکراہ ملجی کے وقت اگر جان بچانے کی خاطر بادل نخواستہ وہ اپنی دفاع سے لاچار ہو جائے اور اسی حالت میں فعلِ بد کا ارتکاب کیا جائے، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کی خاطر اپنی بساط بھر کوشش کرنے اس پر مزید مواخذہ نہیں ہوگا اور یہ فعل اس کی طرف شرعاً منسوب نہیں ہوگا۔

بدکاری پر جبر کے وقت کیا کیا جائے؟

درج بالا عبارات، اور ان کے حاصل شدہ نتائج سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کے لئے ایسے موقع پر اپنے آپ کو قتل کرنا شرعاً درست ہے نہ ہی اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز وقریب سے اپنے آپ کے قتل کرنے کا مطالبہ کرے۔ جہاں تک مرد کا حکم ہے کہ اس کے لئے ایسے موقع پر اپنے آپ کو قتل کرنا یا کروانا

جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کے متعلق دو مختلف پہلوؤں ہیں، اگر اس بات کو دیکھا جائے کہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا کروانے کی صورت میں ایک مسلمان کی جان کا یقینی طور پر مرنا ہے اور بدکاری کرنے کی صورت میں بچے کا ضائع ہونا اس درجہ متیقن یا مظنون نہیں ہے کیونکہ نہیں معلوم کہ اس بدکاری کے نتیجہ میں حمل ہوگا یا نہیں؟ اگر ہو تو اس کی ولادت ہو جائے گی یا نہیں؟ ولادت کے بعد باپ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ضیاع ہوگا یا نہیں؟ جب یہ تینوں باتیں احتمال کے درجہ میں ہیں تو اس موہوم مسلمان بچے کے موہوم طور پر ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ایک موجود جان کو یقینی طور پر کیونکر قتل کیا جاسکتا ہے!

لیکن اگر اس پہلو توجہ مرکوز رکھی جائے کہ خود شریعت مطہرہ میں اس موقع پر مرد کو صبر وہمت کی ترغیب دی ہے چنانچہ اگر اکراہ کے باوجود وہ غیرت سے کام لیکر اس فعلِ بد سے رکتا ہے اور اس بنیاد پر اس کو قتل کیا جاتا ہے تو وہ شہید وماجور ہے حالانکہ دیکھا جائے تو اکراہ معتبر ہی اسی وقت ہے جب کہ مکرَہ کو یقین یا ظن غالب ہو کہ متعلقہ اقدام نہ کرنے کی صورت میں مجھے قتل کیا جائے گا یا کوئی عضو وغیرہ تلف کیا جائے گا، جب اس درجہ تیقن یا ظن غالب کے ہوتے ہوئے بھی شریعت مطہرہ اس کو رکنے اور غیرت پر جم جانے کی تلقین کرتی ہے اور قتل ہو جانے کے بعد اس کو شہید وماجور بھی شمار فرماتی ہے تو بظاہر اس بات کی مزید کوئی خاص بنیاد باقی نہیں رہ پاتی کہ اس کے لئے خود ہی اپنے آپ کو قتل کرنے کی گنجائش دی جائے کیونکہ اس صورت میں اگر جان کا تحفظ بہر حال ضروری ہوتا تو اس کو یہ تلقین وترغیب دی جاتی نہ ہی اس کو شہید تصور کیا جاتا، وجہ واضح ہے کہ زنا پر آمادہ ہونے کی صورت میں جان کا تحفظ ممکن بلکہ مظنون یا متیقن تھا لیکن پھر بھی اس کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

ایک مفید اشکال وجواب

حضرات فقہائے کرام کی درج بالا تفصیلات سے اس اشکال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے جو ان جیسے مسائل کے متعلق کیا جاتا ہے کہ جان کی حفاظت عزت وناموس کی حفاظت پر مقدم ہے ،اس کا تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ مرد پر اگر اکراہ کیا جائے تو جان بچانے کے لئے اس کے لئے یہی بہتر بلکہ ضروری ہے کہ نہ چاہتے ہوئے اس کام پر آمادہ ہو جائے تاکہ اس کی جان محفوظ رہے جو اہم مقاصدِ شریعت میں سے ایک ہے۔جواب یہ ہے کہ یہاں مقابلہ صرف جان وعزت کی حفاظت کا نہیں ہے بلکہ بدکاری کرنے کی صورت میں جس طرح عزت وناموس کا سوال کھڑا ہوتا ہے یوں ہی اس میں ایک معصوم جان کی حفاظت کا مسئلہ بھی ہے کیونکہ عالم اسباب کے پیشِ نظر اسی فعل کے نتیجہ میں بچہ ہوتا ہے اور بدکاری کی صورت میں چونکہ زانی باپ نہیں قرار پاتا،اس لئے بچے کی جان ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔

اسی طرح ان عبارات سے یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ زنا کے حرمت کی بنیاد صرف حق اللہ نہیں ہے بلکہ حق العبد کی وجہ سے بھی یہ حرام ہی ہے۔

تحفظ عصمت کے لئے جان کی بازی کھیلنا

درج بالا تفصیل سے واضح ہوا کہ اگر کسی مسلمان کو بدکاری کرنے پر مجبور کیا جائے اور اس کے پاس اس فعلِ بد سے بچنے کی مادی یا روحانی وغیرہ کوئی ترکیب میسر نہ ہو یا میسر تو ہو لیکن اپنی استطاعت کی حد تک آزمانے کے باجود وہ مفید ثابت نہ ہو ،تو ایسی صورت میں عورت پر ان شاء اللہ کوئی گناہ نہیں ہوگا اور جب گناہ نہیں ہے تو محض اس سے بچاؤ کی خاطر اپنے آپ کو قتل کرنا یا کرانا بھی شرعاً درست نہیں ہے۔البتہ اگر کوئی

عورت غلبہ حال میں ایسا کوئی اقدام کرتی ہے یا اس گنجائش والے حکم سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کرتی ہے، توامید ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

ایک مفید فقہی نظیر: تین طلاق کے باوجود بیوی روکے رکھنا

اسی کی ایک واضح نظیر یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دیدے اور پھر انکار کرے لیکن عورت نے اپنے کانوں سے طلاق کے الفاظ سنے تھے یا کسی معتبر شخص نے اس کو بتایا، لیکن بہرحال عورت کو یقین ہے کہ شوہر نے تین طلاقیں دی ہے لیکن اس کے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے گواہ موجود نہیں ہیں اور دوسری طرف شوہر قسم کھارہا ہے کہ میں نے کوئی طلاق نہیں دی۔ اس صورت میں حال میں کیا کیا جائے گا؟

قاضی تو ظاہر ہے کہ قسم کے مطابق فیصلہ کرے گا اور بیوی کو شوہر کے پاس رہنے اور اس کے حقوق ادا کرنے کا حکم دے گا، لیکن عورت کو یقین ہے کہ ایسا کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہے، تو اب اس بدکاری سے بچنے کے لئے کیا عورت ایسا کرسکتی ہے کہ شوہر کو قتل کرڈالے؟

اس کے متعلق حضرات فقہائے کرام کی آراء مختلف ہیں:

الف: بعض فقہائے کرام اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں کہ عورت کے لئے ایسا اقدام جائز نہیں ہے بلکہ خلع وغیرہ تمام جائز صورتوں کو اختیار کرلے، اس کے بعد جان نہ چھوٹے اور قاضی مجبور کرے تو ذمہ داری شوہر کے ذمہ عائد ہوگی۔ یوں ہی اگر مرد کے متعلق فرض کی جائے کہ بیوی اس پر حرام ہوچکی ہو لیکن اس کے باوجود وہ اس کو

سحر وغیرہ کے ذریعے اپنے ساتھ رہنے اور میاں بیوی جیسے تعلقات قائم کرنے پر مجبور کرتی ہو تو شوہر کے لئے بھی اس کو (محض اس بنیاد پر) قتل کرنا درست نہیں ہے۔

ب: بعض فقہائے کرام کے نزدیک اگر خ   لع وغیرہ تمام جائز راستوں کو اختیار کرنے کے باوجود شوہر بہر حال عورت کو اپنے پاس رکھنے اور ناجائز تعلقات اختیار کرنے پر اصرار کرے اور عورت کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہے کہ شوہر کو قتل کردے تو اس صورت میں قتل کرنا بھی جائز ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دونوں ہی قول معتمد ہیں، تاہم "درمختار" وغیرہ متعدد فقہی مصادر میں پہلے ہی قول ترجیح دی گئی ہے۔[1]

چند عفیف مسلمان عورتوں کے واقعات

ہماری مسلم امت کی تاریخ میں ایسے کئی شریف وعفیف عورتیں گزریں ہیں جن کو عفت وعصمت کا پیکر قرار دینا مناسب ہے، ان کو جب بدکاری کرنے پر مجبور کیا گیا اور ان کو اپنی عفت برقرار رکھنے کی کوئی مفید ترکیب نہ سوجھی، تو بالآخر اپنے جان کی بازی کھیل کر عفت وعصمت کا ثبوت دیا۔ اور متعدد اہل علم نے ان کی اس قربانی کو سراہا۔ یہاں اختصار کے ساتھ اس نوعیت کا عبرت آمیز واقعہ ذکر کیا جاتا ہے۔

عباسی خلیفہ کی بیوی اور ہلاکو خان

علامہ سبکی رحمہ اللہ نے طبقات الشافعیہ میں علامہ عبد العظیم منذری رحمہ اللہ کے حالات کے ضمن میں یہ تاریخی قصہ بھی ذکر کیا ہے کہ:

---

[1] حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب الطلاق، باب صريح الطلاق،ج٣ص٢٥١.

ہلاکو خان نے جب بغداد کو تخت وتاراج کیا تواس کے بعد خلیفہ مقتول کی بیوی کو بدکاری کی نیت سے بلایا،اس غیرت مند خاتون نے اول تو بیش بہا تحائف بھیج دئے تاکہ اس کی برکت سے عزت محفوظ رہے لیکن جب دیکھا کہ ظالم بدکاری ہی اڑا ہے اور وہ بہر صورت ایسا کرنا چاہتا ہے تو اس نے اپنی ایک لونڈی کے ساتھ مل کر ایک عجیب وغریب منصوبہ ترتیب دیا کہ ظالم ہلاکو کے سامنے جب میں آپ کو اس تلوار سے مارنے لگوں تو آپ خوب چیخ وچلانا شروع کرے، پھر میں کہوں گی کہ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے: لو: یہ تلوار اپنے ہاتھ میں لے لو اور مجھے مار دو، یہ امیر المؤمنین کی تلوار ہے یہ یوں اثر کرتی ہے نہ ہی کسی چیز کو زخمی کرتی ہے۔ یہ کہہ کر میں آپ کو تلوار دیدوں گی تو آپ اس وقت مجھے پوری زور بازو سے مار دے۔

یہ کہہ کر دونوں ظالم کے دربار میں حاضر ہو گئیں اور اس سے اس بہادر خاتون نے کہا کہ یہ خلیفہ کی تلوار ہے اور اس کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ یہ اپنے سامنے کی چیز کو تبھی کاٹتی ہے جب خود خلیفہ اس کو استعمال کرے، اگر کوئی اور شخص ہاتھ میں لے کر چلاتا ہے تو کوئی اثر نہیں کرتی۔لو: میں آپ کے سامنے ہی اس کو آزماتی ہوں (تاکہ آپ بھی یہ عجیب وغریب خصوصیت دیکھ کر محظوظ ہو)۔اس کے بعد اس نے تلوار سونت لی، بے چاری لونڈی نے جب ننگی تلوار کو دیکھا تو چلانا شروع کر دیا، خلیفہ مرحوم کی بیوہ نے (منصوبہ کے مطابق) کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ امیر المؤمنین کی تلوار ہے! تو ڈرتی کیوں ہو! لو: اور اس سے مجھے مارو۔یہ کہہ کر تلوار لونڈی کے ہاتھ میں پکڑادی۔لونڈی نے خوب زور وہمت سے تلوار چلائی اور بے چاری بیوے کو دو ٹکڑے کئے۔اس پر ہلاکو خان غمزدہ ہوا اور اس کو اندازہ ہو گیا کہ یہ سارا کچھ ایک منصوبہ تھا۔

علامہ سبکی رحمہ اللہ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ان جیسے واقعات اور بھی ہیں جس میں بعض نیک خاتون نے اپنی عزت وناموس کی حفاظت کے لئے جان کی قربانی دیدی، علامہ دبوسی رحمہ اللہ نے "روضۃ العلماء" میں بھی اس جیسا ایک واقعہ ذکر کیا ہے۔[1]

ان جیسے واقعات کی شرعی حیثیت

لیکن واضح رہے کہ ان جیسے واقعات کی حیثیت شرعی حکم یا قانون کی نہیں ہے اوراس کی وجہ سے شرعی احکام میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ایسے مجبور کن فضاءاور پریشان کن صورت حال میں عورت کو کیا چاہئے؟اس میں وہی تفصیل ہے جو اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہے اور اسی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔تاہم ان جیسی عورتوں کے بارے میں بھی بلا وجہ بدگمانی کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ یہی سمجھا جائے گا کہ اگر کوئی عورت ایسے حالات میں تمام تر ممکنہ تدابیر اختیار کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کو بہر حال مجبور کیا جارہاہو اور سوائے اس کے اس کے سامنے کوئی تدبیر باقی نہ رہے کہ اپنی جان دیدے اور ایسے موقع پر غلبہ حال میں آکر خودکشی کرتی ہے اور نیت یہی ہے کہ بدکاری کے گناہ سے جان چھوٹ جائے تو گو یہ اقدام شرعاً درست نہیں ہے لیکن لاچاری اور نیک نیتی کی وجہ سے ہم اس کے متعلق نیک امید ہی رکھیں گے۔

خصوصاً اس لئے بھی کہ مجبوری کے حالات "اکراہ" کے احکام ہر کسی کو معلوم نہیں ہوتے اور حکم معلوم بھی ہو تو بھی ایسے حالات میں عقل ودماغ کا توازن برابر نہیں رہتا جس کی وجہ سے بروقت مسئلے کا استحضار ہو جائے جبکہ سوچنے اور پوچھنے کی بھی نوبت نہیں

---

[1] طبقات الشافعية الكبرى للسبكي،ج٨ص ٢٧٢.

ہوتی۔ خاص کر صنف نازک میں یہ دونوں اسباب مردوں کی بنسبت زیادہ پائے جاتے ہیں کہ اس کا علمی اشتغال بھی کم ہوتا ہے اور ایسے موقع پر قوت برداشت واستحضار بھی برقرار نہیں رکھ پاتی۔ فقہائے کرام بھی ایسی چیزوں میں جہل کو عذر قرار دیتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ سے ایک ایسا ہی سوال پوچھا گیا کہ تقسیم ہند کے وقت بہت سے مسلمان عورتوں نے اس طرح کے اقدامات کئے تھے کہ ہندو وسکھ کے ہاتھ میں جانے اور ان کے ہاں عزت وناموس لٹنے سے بچنے کے لئے مختلف طریقوں سے خودکشیاں کی تھیں۔ اس کا کیا حکم ہے ؟اس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ:

"ج... قانون تو وہی ہے جو آپ نے ذکر کیا۔ باقی جن لڑکیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے توقع ہے کہ ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہوگا۔"[1]

چوتھی صورت: غیرت کے نام پر قتل کرنا

ہمارے علاقوں میں قتل کی ایک رائج قسم غیرت کے نام پر قتل کرنا بھی ہے، اگر کسی مرد وعورت کو ناجائز تعلقات اور بدکاری کرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے تو دونوں کو ننگ وغیرت کے طور پر قتل کردیتے ہیں ،اس کو غیرت کے نام پر قتل کرنا کہا جاتا ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا شریعت کی نظر میں بھی اس طرح غیرت کے نام پر قتل کردینے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بدکاری کی وجہ سے قتل کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

---

[1] آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد ۸ ص ۳۱۱

الف: عین بدکاری کرتے ہوئے قتل کرنا
ب:اس فعلِ بد کے کر چکنے کے بعد قتل کرنا۔

زانی کا قتل کرنا

جہاں تک پہلی صورت ہے یعنی عین بدکاری کرتے وقت قتل کرنا، تو اس کا حکم یہ ہے کہ یہ تعزیر کے باب میں سے ہے لہٰذا جس شخص کو کسی کے ناجائز تعلقات یا بدکاری کا علم ہو جائے تو اس کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نافرمانی کے خلاف اٹھے اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کو ختم کرنے کی کوشش کرے ،اگر زبانی روکنے اور ڈانٹنے سے کام چل جائے تو بہتر، اگر اس کی وجہ سے بدکاری کرنے والے اپنے فعلِ بد سے باز نہ آئیں اور دیکھنے والے کی استطاعت ہو تو گناہ کے خاتمہ کے لئے اس سے بھی دریغ نہ کیا جائے، اگر یہ تدبیر بھی کار گر ثابت نہ ہو اور اس کے بعد بھی وہ اپنے فعلِ بد کو برابر جاری رکھیں اور قتل کرنے کے علاوہ کوئی طریقہ مفید ثابت نہ ہو، نہ زبانی روک تھام نہ ڈراؤ دھمکاؤ اور مار پیٹ، تو اس کے بعد یہ بھی اختیار ہے کہ ان کو قتل کیا جائے [1]۔ "محیط برہانی" میں ہے:

---

[1] **زانی کو قتل کرنے کے متعلق فقہائے کرام کی آراء:**

یہ محتاط صورت ذکر کی گئی ہے، یہاں قتل کرنے سے پہلے جن تدابیر کو اختیار کرنے کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے متعلق فقہی عبارات مختلف ہیں: بعض میں یہ شرط ذکر کی گئی ہے کہ اگر قتل سے کم درجہ کے کسی تدبیر کے ذریعے سے گناہ کو روکا جا سکے تو قتل کرنا درست نہیں ہے جبکہ بعض دیگر عبارات میں اس قید کے بغیر بھی قتل کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اب ان عبارات کے متعلق متاخرین فقہائے کرام کی آراء مختلف ہو گئیں:

الف: بعض نے دوسری قسم کی عبارات کو مطلق سمجھ کر پہلی قسم کی عبارات میں ذکر کردہ قید کے ساتھ مقید قرار دیا۔

وسئل الفقيه أبو جعفر: عن رجل وجد رجلاً مع امرأته أيحل له قتله؟ قال: إن كان يعلم أنه يزجر عن الزنا بالصياح أو بالضرب بما دون السلاح، فإنه لا يقتله، ولا يقاتل معه بالسلاح، وإن علم أنه لا يزجر إلا بالقتل والمقاتلة معه بالسلاح؛ حل له القتل، فكأنه إنما أخذ هذا من قول محمد رحمه الله، فإن محمداً رحمه الله أمره بالتحري مرة أخرى بعدما تحقق الشر بالتحري ليعلم أنه هل يزجر بما دون القتل، أو لا ينزجر-[1]

ترجمہ:" فقیہ ابو جعفرؒ سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کے ساتھ کسی اجنبی مرد کو دیکھا تو کیا اس کے لئے اس مرد کو قتل کرنا حلال ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ اگر وہ جانتا ہے کہ یہ محض چیخ وپکار اور مار پیٹ سے بغیر اسلحہ کے بھی بھاگ جائے گا تو اس کو قتل نہیں کریگا اور

ب: بعض نے اس بات پر فرق کرنے کی بنیاد رکھی کہ جس عورت کے ساتھ خلوت یا بدکاری کا عمل جاری ہے وہ اس دیکھنے والے شخص کی اپنی بیوی، محرم ہے یا کوئی اجنبی عورت ہے؟ پہلی صورت میں درج بالا شرط کے بغیر بھی قتل کرنا جائز ہے جبکہ دوسری صورت میں اس شرط کا لحاظ ضروری ہے۔

ج: علامہ شامی رحمہ اللہ نے یہ فرق کیا کہ اگر عین بدکاری کی حالت میں دیکھے تو یوں ہی قتل کرنا جائز ہے اور اگر عین بدکاری کی حالت نہ ہو بلکہ اس کے دواعی ومقدمات کی حالت میں دیکھے تو اس صورت میں درج بالا شرط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔(تفصیل کے لئے درج بالا عبارات کے ساتھ ساتھ مزید ملاحظہ فرمائیں: ۱:البحر الرائق، فصل فی التعزیر، ج۵ ص۴۵۔ ردالمحتار مع تقریرات رافعی، باب التعزیر، ج۴ ص۶۳۔ احسن الفتاوی، ج۵ ص۵۳۲)۔

[1] المحيط البرهاني في الفقه النعماني (٥/ ٣٠٤)

اگر وہ جانتا ہے کہ یہ صرف اسلحہ ہی سے باز آئے گا تو اس کے لئے قتل کرنا حلال ہے گویا کہ انہوں نے یہ مسئلہ امام محمدؒ کے قول سے اخذ کیا ہے کیونکہ امام محمدؒ کے نے شر کے ثابت ہونے کے بعد دوبارہ تحری کا حکم دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ آیا قتل کے علاوہ اس کو تنبیہ ہوتی ہے یا نہیں؟"۔

"تبیین" میں ہے:

وسئل الهندواني عن رجل وجد رجلا مع امرأة يحل له قتله قال إن كان يعلم أنه ينزجر بالصياح والضرب بما دون السلاح لا وإن علم أنه لا ينزجر إلا بالقتل حل له القتل وإن طاوعته المرأة حل له قتلها أيضا وفي المنية رأى رجلا مع امرأة يزني بها أو مع محرمه وهما مطاوعتان قتل الرجل والمرأة جميعا.[1]

ترجمہ:" اور فقیہ ابو جعفرؒ ھندوانیؒ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کے ساتھ کسی اجنبی مرد کو دیکھا تو کیا اس کے لئے اس مرد کو قتل کرنا حلال ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ اگر وہ جانتا ہے کہ یہ محض چیخ و پکار اور مار پیٹ سے بغیر اسلحہ کے بھی بھاگ جائے گا تو اس کو قتل نہیں کریگا اور اگر وہ جانتا ہے کہ یہ صرف اسلحہ ہی سے باز آئے گا تو اس کے لئے قتل کرنا حلال ہے،اور گر عورت کی رضامندی سے زنا کیا تو عورت

[1] تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق وحاشية الشلبي (٣/ ٢٠٨)

کو بھی قتل کرنا درست ہے،اور "منیہ" نامی کتاب میں ہے: کہ اگر کسی نے اپنی بیوی یا کسی محرم عورت کے ساتھ کسی اجنبی مرد کو زنا کرتے ہوئے دیکھا اور یہ دونوں کی رضامندی ہو تو دونوں کو قتل کرنا حلال ہے"۔

زنا کرنے کے بعد قتل کرنا

دوسری صورت یہ ہے کہ عین بدکاری کے وقت نہیں بلکہ کسی نے ماضی میں زنا کا ارتکاب کیا تھااور اب اس کا علم ہواتو علم ہو جانے کے بعد اس جرم میں ملوث مرد و عورت دونوں کو قتل کرنا،اس کا حکم بھی یہ ہے کہ یہ چونکہ تعزیری اقدام ہے لہٰذا حکومتِ وقت کا تو فریضہ ہے کہ حدود و تعزیرات کا تسلی بخش شرعی نظم قائم کریں اور اگر شرعی طریقہ اثبات کے مطابق یہ جرم ثابت ہو جاتا ہے تو اس کی واقعی سزا جاری کریں،اور اس حد تک عوام کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظم کے قائم کرانے میں اپنی بساط بھر کوشش کریں، لیکن عام لوگوں کو از خود حدود قائم کرنے اور سابقہ جرائم پر تعزیری سزا دینے کا اختیار نہیں ہے۔

عوام کو حقِ تعزیر نہ دینے پر اشکال

یہاں بجا طور پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر میں بد قسمتی سے ارباب حکومت اپنے اس اہم فریضہ کی تکمیل تو کیا کرتے وہ تو اس کو اپنے ذمہ داری سمجھنے ہی سے غافل ہیں بلکہ بسااوقات تک ان کو سمجھانا اور اس کو ایک شرعی فریضہ باور کرانا ہی مشکل ہے تو ایسے ناگفتہ بہ حالات میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں،ایک تو یہی کہ عوام کو اس کا مکلف بنایا جائے اور دوسری یہ کہ ارباب حکومت کے غفلت کی وجہ سے اس باب کو یوں ہی معطل چھوڑ

دیاجائے اور ظاہر ہے کہ مکمل طور پر چھوڑ دینے کے بجائے یہی بہتر ہے کہ عوام کے کندھوں پر یہ بوجھ لادا جائے، اگر عوام کو اس کا مکلف نہ بھی ٹھہرایا جائے تو بھی کم از کم ان سے یہ اختیار تو سلب نہ کی جائے کہ کسی طرح ان کو اقامتِ تعزیر کا حق ہی حاصل نہ رہے!

یہ اشکال بہت اہم اور واقعی ہے اور واقعۃً دونوں پہلوؤں میں کچھ نہ کچھ مصالح بھی ہیں اور مفاسد و خطرات بھی۔ علامہ جمال الدین بزدوی رحمہ اللہ نے ایک ایسی ہی موقع پر ارشاد فرمایا کہ:

أنا متحير في هذه المسألة لا أقدر أن أقول تنفيذ أحكامهم لما أرى من التخليط والجهل والجراءة فيهم، ولا أقدر أن أقول لا تنفيذ؛ لأن أهل زماننا كذلك فلو كذلك فلو أفتيت بالبطلان أدى إلى إبطال الأحكام جميعا يحكم الله بيننا وبين قضاة زماننا أفسدوا علينا ديننا، وشريعة نبينا صلى الله عليه وسلم لم يبق منهم إلا الاسم والرسم.[1]

ترجمہ: "میں اس بات میں حیران و پریشان ہوں میں یہ بھی نہیں کہ آج کل کی عدالتوں اور قاضیوں کا فیصلہ نافذ ہے کیونکہ ان میں خلط ملط کرنا، جہالت کا ہونا اور احکام شرع پر جرت کرنا عام ہے، اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ نافذ نہیں اس لئے کہ اہل زمانہ میں بھی یہی خرابیاں موجود ہیں جب اس طرح ہے تو اگر میں

[1] رد المحتار على الدر المختار، كتاب القضاء، ج٥ ص٣٦٣.

عدم نفاذ کا فتوی دیتا ہوں تو تمام احکام کا بطلان لازم آتا ہے، اللہ تعالی ہمارے اس زمانے کے قُضاۃ کے درمیاں فیصلہ فرمائنگے، ان قاضیوں نے تو ہمارے دین اور آپ ﷺ کی شریعت مطہرہ کو فاسد اور تباہ کر دیا اور ان کا تو صرف نام اور رسم ہی باقی رہ گیا ہے"۔

بعض اہل علم کا موقف

اس افسوسناک پہلو کی وجہ سے متعدد اہل علم کا یہ موقف رہا ہے کہ اگر حکومت شرعی منکرات کرنے والے پر تعزیر قائم نہیں کرتی اور اس سلسلے میں مجرمانہ سستی وغفلت کا مظاہرہ کرے، تو اس صورت میں عام مسلمان لوگ تعزیر قائم کرنے کے مجاز ہوں گے، چنانچہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قديما كان تختلج في قلبي كثيرا أنّ الحكومةَ إذا قعدتْ عمّا عليه مِن إقامة التّعزير فالعامّة تنوب عنها لكنْ لم أكنْ أفتي به لعدم علمي بثبوته في كلام الفقهاء..[1]

ترجمہ: "کافی عرصہ سے یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی ہے کہ جب حکومت اپنی تعزیر قائم کرنے والی ذمہ داری میں کوتاہی کرے تو عام لوگ بھی اس کو قائم کر سکتے ہیں، لیکن میں اس پر فتوی نہیں دیتا کیونکہ مجھے فقہاء کی عبارات میں اس کی کوئی تصریح نہیں ملی"۔

اس کے بعد شامی کی ایک عبارت ذکر فرمائی ہے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر ارباب حکومت منکرات کے ارتکاب پر تعزیر قائم کرنے میں کوتاہی سے کام لینا شروع

---

[1] احسن الفتاوی، الحکم الحقانی فی قتل الزانی، ج ۵ ص ۵۳۸

کریں تو فی الجملہ عوام کو بھی اس کا حق حاصل ہو جاتا ہے،اور اس مقالہ کے آخر میں دوبارہ اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ عوام کو فی الجملہ تعزیری قتل کرنے کی اجازت ہے۔

عوام کو اختیار دینے کے نقصانات

لیکن دونوں پہلوؤں کے مصالح ومفاسد کا موازنہ کرنے کی ضرورت ہے،دونوں صورتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو اختیار دینے کی صورت میں مفاسد کا پلہ غالب ہوتا ہے، حدود جیسے دقیق مسائل میں عوام سے حدود وقیود کی پابندی کرنے کی توقع رکھنا اکثر بے سود ہے اور اس طرح ذاتی رنجش وانتقام کو پورا کرنے کا راستہ چوپٹ کھل جائے گا، اثباتِ جرم کے شرعی ضابطہ کا کوئی تسلی بخش نظم نہ ہونے کی وجہ سے حدود وتعزیرات قائم کرنے کے باب میں بے پناہ بے احتیاطی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، امن وامان کی فضاء قائم نہیں رہے گی اور اس کے علاوہ متعدد مفاسد کا خدشہ ہے اس لئے زیادہ قرینِ مصلحت یہی معلوم ہوتا ہے کہ عوام کے ناتواں کندھوں پر یہ بارِ گراں نہ رکھا جائے جس کی کماحقہ تحمل کی طاقت ان میں نہیں ہے۔

حضرات فقہائے کرام نے بھی اس پہلو کا لحاظ رکھا اور انہی مفاسد کے خطرے کی وجہ سے عوام کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ از خود حدود یا تعزیرات قائم کر سکیں، "بدائع الصنائع" میں ہے:

> وأما شرائط جواز إقامتها فمنها ما يعم الحدود كلها، ومنها ما يخص البعض دون البعض، أما الذي يعم الحدود كلها فهو الإمامة: وهو أن يكون المقيم للحد هو

الإمام أو من ولاه الإمام وهذا عندنا، وعند الشافعي هذا ليس بشرط...

ترجمہ: "اور جہاں تک حد قائم کرنے کے جواز کی شرائط ہیں: تو بعض شرائط تو تمام حدود کو شامل ہیں اور بعض، بعض صورتوں کے ساتھ خاص ہے، جہاں تک وہ شرائط ہیں جو تمام حدود کو عام ہے تو وہ امام اور حاکم کا ہونا ہے یعنی حد قائم کرنے کا اختیار صرف امام یا اس کے نائب کو ہے یہ تو ہمارے احناف کا مسلک ہے جبکہ امام شافعیؒ کے ہاں امام کا ہونا شرط نہیں"۔

اس سے واضح ہوا کہ کسی بھی حد کو قائم کرنے کے لئے امام وحاکم کا ہونا شرط ہے کہ وہ خود حد قائم کرے یا اپنے کسی نائب کے ذریعے یہ فریضہ انجام دے، عام افراد کے لئے از خود ایسا اقدام کرنا درست نہیں ہے۔ اس کے بعد اس شرط کے دلائل وفوائد گنواتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

(ولنا) أن ولاية إقامة الحدود ثابتة للإمام بطريق التعيين، والمولى لا يساويه فيما شرع له بهذه الولاية، فلا يثبت له ولاية الإقامة استدلالا بولاية إنكاح الصغار والصغائر؛ لأنها لما ثبتت للأقرب - لم تثبت لمن لا يساويه فيما شرع له الولاية وهو الأبعد، وبيان ذلك أن ولاية إقامة الحد إنما ثبتت للإمام؛ لمصلحة العباد وهي صيانة أنفسهم وأموالهم وأعراضهم؛ لأن القضاة يمتنعون من التعرض خوفا من إقامة الحد عليهم، والمولى لا يساوي الإمام في هذا المعنى؛ لأن ذلك يقف

على الإمامة، والإمام قادر على الإقامة؛ لشوكته ومنعته وانقياد الرعية له قهرا وجبرا، ولا يخاف تبعة الجناة وأتباعهم؛ لانعدام المعارضة بينهم وبين الإمام، وتهمة الميل والمحاباة والتواني عن الإقامة منتفية في حقه فيقيم على وجهها فيحصل الغرض المشروع له الولاية بيقين.[1]

ترجمہ: "ہماری دلیل یہ ہے کہ حدود قائم کرنے کا اختیار صرف امام ہی کے لئے ثابت ہے اور اس ولایت کی وجہ سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں آقا اس میں امام کے مساوی نہیں، لہذا آقا کے لئے حدود قائم کرنے کی ولایت ثابت نہیں ہوگی، اس مسئلہ کو صغار کے نکاح کرانے کے مسئلہ پر قیاس کیا جائے گا کیونکہ جب اقرب رشتہ دار کے لئے ولایت ثابت ہو تو ابعد کے لئے ثابت نہیں ہوگی جو نفس ولایت میں اس کے ساتھ شریک ہے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ حد قائم کرنے کی ولایت لوگوں کی مصلحت کی وجہ سے امام ہی کے لئے ثابت ہے اور وہ مصلحت لوگوں کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت ہے، اس وجہ سے کہ جب لوگوں کے دلوں میں حد جاری ہونے کا خوف ہو تو ان چیزوں سے تعرض نہیں کرینگے، اور آقا اس معنی میں امام کے ساتھ شریک نہیں کیونکہ یہ منصب امامت پر موقوف ہے اور امام اپنی شان وشوکت، قوت اور رعایا کو زبردستی بھی تابع کرنے کی وجہ سے حدود قائم کرنے پر قادر ہے، اور امام کو جنایت کرنے والوں اور اس کے متبعین سے خوف نہیں ہوتا کیونکہ یہ امام سے معارضہ ہی نہیں کر سکتے اور کسی ایک کی طرف میلان، طرف داری، اور حد جاری کرنے میں سستی

---

[1] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، كتاب الحدود، ج٧ ص٥٧.

کرنے کی تہمت امام کے حق میں منتفی ہے، لہذا امام حدود کو اسی طرح قائم کریگا تو وہ غرض حاصل ہو جائے گی جس کے لئے ولایت مشروع ہوئی ہے"۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے اس کے بعد حدود و تعزیرات کے درمیان کچھ مفید فرق ظاہر کئے اور اس کے متعلق بڑا مفید و تفصیلی کلام فرمایا ہے جس میں یہ لکھا کہ حدود کا قائم کرنا مسلمان قوم کے اہم مصالح عامہ میں سے ہے۔ نیز "الاختیار" میں ہے:

قال: (ولا يقيم المولى الحد على عبده إلا بإذن الإمام) لأن الحد حق الله تعالى فلا يستوفيه إلا نائبه، وهو الإمام أو نائبه؛ بخلاف التعزير لأنه حق العبد حتى جاز تعزير الصبي، وحقوق الشرع موضوعة عنه، ويؤيد ذلك قوله صلى الله عليه وسلم: (أربع إلى الولاة) وعد منها إقامة الحدود.[1]

ترجمہ: "آقا اپنے غلام پر امام کی اجازت کے بغیر حد جاری نہیں کریگا ، کیونکہ حد اللہ تعالی کا حق ہے لہذا اللہ تعالی کا نائب ہی اس کو جاری کریگا جو کہ امام یا اس کا نائب ہی ہے البتہ تعزیر چونکہ حقوق العباد میں سے ہے یہاں تک کہ بچے کو بھی تعزیری سزا دینا جائز ہے حالانکہ وہ اسلام کا مکلف نہیں ،اور اسی کی تائید آپ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے: کہ چار(۴) چیزوں کا اختیار صرف حکام کو حاصل ہے اور اس میں حدود کو بھی شمار فرمایا"۔

---

[1] الاختيار لتعليل المختار،كتاب الحدود،ج٤ ص٨٧.

پانچویں صورت: جاسوس کا حکم

جاسوسی کرنا ایک ایسا جرم ہے جو ہر ملک و قوم کے ہاں ایک سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے، کوئی بھی دستور اس کو برداشت نہیں کر پاتا، نہ ہی کوئی قوم وملک اس بات کوی اجازت دیتا ہے کہ اس کی خفیہ رازوں کا سراغ لگاکر دشمن کے سامنے بے نقاب کیا جائے، اسی طرح مسلمانوں اور اسلامی حکومت کے خلاف اگر کوئی شخص کسی کفریہ طاقت کے لئے جاسوسی کرے تو دیگر تمام دساتیر و قوانین کی طرح شریعت مطہرہ کی روشنی میں بھی یہ ایک سنگین جرم ہے، اگر کوئی شخص اس جرم کا مرتکب ہے اور اس کو پکڑا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس کو کوئی سزا دیا جائے گی یا نہیں؟ اور کیا اس جرم کی پاداش میں اس کو قتل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق معاصر وضعی قوانین مختلف ہیں، لیکن شرعاً اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، جس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

جاسوس کی مختلف صورتیں

جاسوس اگر حربی کافر ہے یعنی اس نے اسلام قبول کیا ہو نہ ہی کسی اسلامی ملک کا ویزہ لیا ہو اور اس کے قوانین کی پابندی کرنے کا عہد وپیمان کیا ہو، ایسے شخص کو اگر اسلامی مملکت کے خلاف جاسوسی کرنے کے جرم میں پکڑا جاتا ہے تو اس کو قتل کیا جائے گا۔

جاسوس اگر کافر ذمی ہے یعنی دین اسلام قبول کرنے کی نعمت سے تو محروم ہو لیکن کسی اسلامی حکومت کا ویزہ لیکر اس کے تمام قوانین کو تسلیم کیا ہو اور اس کے ماتحت زندگی گزارنے کا وعدہ کیا ہو، اس کے باوجود وہ غیر اسلامی طاقت کے لئے جاسوسی کے جرم میں پکڑا جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نے جو معاہدہ کیا تھا اس کی پابندی نہیں

کر رہا ہے لہٰذا اس کا معاہدہ ٹوٹ جائے گا اور اس جرم کی پاداش میں اس کو قتل کیا جائے گا۔ یہ دو صورتیں اکثر فقہائے کرام کے نزدیک اتفاقی ہیں۔

مسلمان جاسوس کا حکم اور مذاہب اربعہ

اگر کوئی جاسوس مسلمان ہو اور دینِ اسلام قبول کرنے کے باوجود وہ مسلمانوں اور ان کی مملکت کے خلاف جاسوسی کے جرم میں پکڑا جائے تو کیا حربی اور ذمی کافر کی طرح اس کو اس جرم کی پاداش میں قتل کیا جائے گا یا اس کا کیا حکم ہے؟ اس بات میں ائمہ مجتہدین کی آراء مختلف ہیں:

الف: اس کو قتل نہیں کیا جائے گا البتہ قتل کے علاوہ کوئی مناسب تعزیری سزا دی جائے۔ یہ مذہب احناف، شوافع اور اکثر حنابلہ کا ہے۔

ب: قتل کیا جائے۔ یہ موقف اکثر موالک کا ہے۔

ج: جاسوسی بھی دیگر جرائم کی طرح موجب تعزیر ہے اور تعزیر کی کوئی معین شکل لازم نہیں ہے بلکہ اس کا اختیار اربابِ اقتدار کو ہے کہ وہ قوم وملت کی مصلحت کو سامنے رکھ کو کوئی مناسب سزا تجویز کرے، اگر ان کے خیال میں مصلحت اسی میں ہو کہ ایسے مجرم کو قتل کیا جائے تو قتل کرنا بھی جائز ہے۔ یہ موقف بعض اہلِ علم کا ہے۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی یہی موقف اختیار فرمایا ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وسألت يا أمير المؤمنين عن الجواسيس يوجدون وهم من أهل الذمة أو أهل الحرب أو من المسلمين؛ فإن كانوا من أهل الحرب أو من أهل الذمة ممن يؤدي الجزية من

اليهود والنصارى والمجوس فاضرب أعناقهم، وإن كانوا من أهل الإسلام معروفين فأوجعهم عقوبة وأطل حبسهم حتى يحدثوا توبة.[1]

ترجمہ: "اے امیر المؤمنین (ھارون الرشید) آپ نے ذمی، حربی، اور مسلمان جاجوس کے بارے میں حکم پوچھا ہے، تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ حربی ہو یا ایسا ذمی ہو جو یہود، نصاری یا مجوس میں سے ہو اور جزیہ ادا کرتا ہو تو اس کو قتل کر دے، اور اگر وہ لوگوں کے درمیان اسلام کے ساتھ مشہور ہو تو اس کو عبرت ناک سزا دے کر اتنی دیر قید میں رکھ کہ وہ توبہ کر لے"۔

علامہ ابن فرحون مالکی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وعندنا يجوز قتل الجاسوس المسلم إذا كان يتجسس بالعدو وإليه ذهب بعض الحنابلة.[2]

ترجمہ: "اور ہمارے مالکیہ کے ہاں جو مسلمان دشمن کے لئے جاسوسی کرتا ہو اسے قتل کرنا جائز ہے اور اسی کی طرف بعض حنابلہ بھی گئے ہیں"۔

مشہور مفسر امام شمس الدین قرطبیؒ مالکی رحمہ اللہ نے سورۃ ممتحنہ کی تفسیر میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ اگر کوئی شخص جاسوس بن کر مسلمانوں کے راز کی باتیں دشمن تک پہنچائے تو اگر اس کا دین

---

[1] الخراج لأبي يوسف،عقوبة الجاسوس ص: ۲۰۷.

[2] تبصرة الحكام في أصول الأقضية ومناهج الأحكام،الفصل الحادي عشر،ج۲ص۲۹۷.

واعتقاد دست ہو، صرف دنیوی حرص ولالچ کی وجہ سے ایسی حرکت کررہاہو تواس سے وہ کافرنہیں ہوگا، لیکن کیااس کو قتل بھی کیاجائے گایانہیں؟اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

اختلف الناس فيه، فقال مالك وابن القاسم وأشهب: يجتهد في ذلك الإمام. وقال عبد الملك: إذا كانت عادته تلك قتل، لأنه جاسوس، وقد قال مالك بقتل الجاسوس- وهو صحيح لإضراره بالمسلمين وسعيه بالفساد في الأرض. ولعل ابن الماجشون إنما اتخذ التكرار في هذا لأن حاطبا أخذ في أول فعله. والله أعلم.[1]

ترجمہ:" جاسوس کے متعلق اختلاف ہے،چنانچہ امام مالکؒ، ابن قاسمؒ،اور اشہبؒفرماتے ہیں:اس کی سزاکے بارے میں حاکم اجتہاد کریگا،اور عبدالملکؒ فرماتے ہے اگراس کی عادت ہی جاسوسی ہو تواس کو قتل کیاجائے گا،اور تحقیق امام مالکؒ نے بھی جاسوس کو قتل کرنے کا قول اختیار کیاہے اور بظاہر یہی صحیح ہے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے،اور شاید کہ ابن ماجشونؒ نے عادی ہونے کی شرط اس وجہ سے لگائی ہے کہ حضرت حاطبؓ سے پہلی مرتبہ اس طرح ہو تھا"۔

علامہ قیروانی مالکی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] تفسير القرطبي،تفسير سورة الممتحنة،ج١٨ ص٥٢.

من كتاب ابن سحنون عن أبيه: وإذا وجدنا بأرض الإسلام عيناً لأهل الشرك، وهو حربى دخل بغير أمان، أو كان ذمياً أو مسلماً يكاتبهم بعورات المسلمين: فإن كان الحربى فللإمام قتله وله استحياؤه كمحارب ظفرنا به، وللإمام أخذ ماله ولا خمس فيه وهو فىء. فإن أسلم قبل ان يقتل فأنه لا يقتل ويبقى رقيقاً كأسير أسلم. وإما المسلم يكاتبهم فأنه يقتل ولا يستتاب وماله لورثته، وهو كالمحارب والساعى فى الارض فساداً. وقال بعض أصحابنا: يجلد جلداً منكلاً ويطال حبسه وينفى من موضع كان فيه بقرب المشركين. قال: وان كان ذمياً قتل ليكون نكإلا لغيره. ومنه ومن العتبية قال ابن القاسم: يقتل الجاسوس ولا تعرف لهذا توبة. وقا ابن وهب عن مالك فى الجاسوس المسلم على الإسلام: ما سمعت فيه بشىء وليجتهد فيه الإمام، ورواه ابن القاسم عن مالك فى العتبية. قال ابن سحنون قال ابن وهب: إذا ثبت ذلك عليه قتل إلا ان يتوب. قال ابن المواز قال ابن القاسم: ان ظاهر على أمور المسلمين بأمر دل به على عوراتهم قتل. وان لم يكن فيما كان منه مظاهرة على عوراتهم سجن حتى تعرف توبته. وقال ابن الماجشون:

ينظر فيه، فإن ظن به الجهل وعرف بالغفلة وان مثله لا عور عنده وكان منه المرة ولم يكن عادةً وليس من أهل الطعن على الإسلام فلينكل لغيره. وان كان معتاداً وتوطأ عليه فليقتل.١

ترجمہ:"جب ہم مسلمانوں کی زمین پر ایسے حربی کو کفار کے لئے جاسوسی کرتا ہوا پالے جو بغیر امن کے داخل ہوا ہو، یا ایسا ذمی یا مسلمان ہو جو مسلمانوں کے راز کفار کے سامنے ظاہر کرتا ہو، تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ حربی کو امام قتل بھی کر سکتا ہے اور زندہ بھی چھوڑ سکتا ہے جیسا کہ جب ہم محارب کو پکڑلے، اور امام اس کا مال بھی لے سکتا ہے اس میں خمس نہیں ہو گا اور یہ مال فیء ہو گا، اور اگر قتل سے پہلے مسلمان ہو گیا تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا اور اس کو غلام بنایا جائے گا جیسے: کوئی قیدی مسلمان ہو جائے، اور اگر مسلمان جاسوسی کرے کفار کے لئے تو اس کو قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، اور مال اس کے ورثاء کو ملے گا اور اس کا حکم اس محارب اور اس شخص کی طرح ہے جو زمین میں فساد پھیلانے والا ہو۔ ہمارے بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ اس کو عبرت ناک کوڑے مارے جائنگے اور عرصہ دراز تک قید میں رکھا جائے گا اور اس کو وہاں سے جلاوطن کر کے کفار کے قریب بھیجا جائے گا، اور اگر ذمی ہو تو عبرت کے لئے قتل کیا جائے گا، اور ابن القاسمؒ فرماتے ہے کہ جاسوس کو قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول ہونے کا قول کسی نے اختیار نہیں کیا، اور و هبؒ نے امام مالکؒ سے اس مسلمان کے متعلق جو اسلام کے خلاف جاسوسی کرے نقل کیا ہے کہ: اس بارے میں، مجھے کچھ علم نہیں بلکہ امام سزا کے بارے میں اجتہاد کرے گا، امام مالکؒ سے یہی قول نقل کیا ہے، ابن سحنون نے و هبؒ کے واسطہ سے یہ نقل کیا ہے کہ:

١ النوادر والزيادات على ما في المدونة من غيرها من الأمهات،فى الجاسوس من مسلم أو حربى أو معاهد،ج ٣ص ٣٥٢.

جب اس پر جاسوسی ثابت ہو جائے تو قتل کیا جائے گا ہاں اگر توبہ کرلے تو پھر قتل نہیں کیا جائے گا، :اگر اس کی جاسوسی کی وجہ سے کفار مسلمانوں کے راز پر واقف ہو گئے تو قتل کیا جائے گا، اور اگر کفار مسلمانوں کے راز پر واقف نہیں ہوئے تو قید کیا جائے گا یہاں تک کہ توبہ کرلے۔ ابن ماجشونؒ فرماتے ہے کہ :اگر جاسوسی جہالت اور غفلت کی وجہ سے کی ہو اور اس جیسے امور کو وہ راز نہ سمجھتا ہو اور پہلی مرتبہ ایسا کیا ہو عادت نہ ہو اور اسلام پر اعتراضات کرنے والا بھی نہ ہو تو اس کو عبرت ناک سزا دی جائے گی، اور اگر عادی جاسوس ہو تو قتل کیا جائے گا"۔

علامہ ابن الملقن شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أما الجاسوس المسلم: فقال الشافعي، والأوزاعي [وأبو حنيفة] وبعض المالكية والجمهور: يعزره الإمام بما يراه من ضرب وحبس ونحوهما ولا يجوز قتله. وقال مالك: يجتهد فيه الإمام، ولم يفسر الاجتهاد، ونقل القاضي عياض: عن أكابر [أصحابه] أنه يقتل، قال: واختلفوا في تركه بالتوبة، وقال [ابن] الماجشون: إن عرف [قتل] وإلَّا عزر.[1]

ترجمہ: "جہاں تک مسلمان جاسوس کا حکم ہے تو اس بارے میں امام شافعیؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابو حنیفہؒ، بعض مالکیہ اور جمہورؒ فرماتے ہیں کہ :امام جو مناسب سمجھے وہی سزا دے اگرچہ وہ مار پیٹ یا قید کرنے یا اس کے علاوہ کسی صورت میں ہو، اور اس کو قتل کرنا جائز نہیں، اور امام مالکؒ فرماتے ہے کہ امام سزا کے بارے

[1] الإعلام بفوائد عمدة الأحكام، ج ١٠ ص ٣٢٢.

میں اجتہاد کرے گا اور اجتہاد کی تفسیر نہیں کی، اور قاضی عیاضؒ نے اکابر صحابہؓ سے نقل کیا ہے کہ اس کو قتل کیا جائے گا، اور قاضی عیاضؒ فرماتے ہے کہ توبہ کرنے کے بعد چھوڑنے کے بارے میں اختلاف ہے، ابن ماجسہ ثونؒ فرماتے ہے کہ: اگر جاسوسی میں مشہور ہو تو قتل کیا جائے گا ورنہ تعزیری سزادی جائے گی"۔

علامہ مرداوی شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وجوز ابن عقيل قتل مسلم جاسوس للكفار. وزاد ابن الجوزي: إن خيف دوامه. وتوقف فيه الإمام أحمد – رحمه الله –. وقال ابن الجوزي في كشف المشكل: دل حديث حاطب بن أبي بلتعة – رضي الله عنه – على أن الجاسوس المسلم لا يقتل. ورده في الفروع. وهو كما قال. وعند القاضي: يعنف ذو الهيئة. وغيره يعزر. وقال الأصحاب: ولا يجوز قطع شيء منه، ولا جرحه، ولا أخذ شيء من ماله قال في الفروع: فيتوجه أن إتلافه أولى، مع أن ظاهر كلامهم: لا يجوز. وجوز الشيخ تقي الدين رحمه الله التعزير بقطع الخبز، والعزل عن الولايات.[1]

---

[1] الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف،ج١٠ ص٢٤٩.

ترجمہ: "اورابن عقیلؒ نے اس مسلمان کے قتل کو جائز قرار دیا ہے جو اسلام کے خلاف جاسوسی کرے، اور ابن جوزیؒ نے ساتھ یہ قید بھی لگائی ہے کہ دائمی جاسوس ہو، اور امام احمدؒ نے اس میں توقف اختیار کیا ہے، اور ابن جوزیؒ "کشف المشکل" میں فرماتے ہے کہ حاطبؓ بن ابی بلتعہ کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمان جاسوس کو قتل نہیں کیا جائے گا، لیکن "فروع" میں اس کو رد کیا گیا ہے، اور قاضیؒ کے ہاں صاحب حیثیت و مرتبہ شخص کو صرف تنبیہ کی جائے گی اور دیگر افراد کو تعزیری سزا دی جائے گی، اور اصحاب الرائی (احناف) کے ہاں اس کے کسی عضو کو کاٹنا، یا زخمی کرنا، یا اس کا مال لینا درست نہیں، "فروع" نامی کتاب میں ہے: کہ مال تلف کرنا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے حالانکہ ظاہری عبارات عدم جواز پر دلالت کرتی ہے، اور شیخ تقی الدینؒ نے عضو کاٹنے اور معزول کرنے کے ساتھ تعزیر کو جائز قرار دیا ہے"۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ "فتح مکہ" سے حاصل ہونے والے فوائد ومسائل کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وفيها: جواز قتل الجاسوس وإن كان مسلما؛ لأن عمر رضي الله عنه سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم قتل حاطب بن أبي بلتعة.. وهذا مذهب مالك، وأحد الوجهين في مذهب أحمد، وقال الشافعي وأبو حنيفة: لا يقتل، وهو ظاهر مذهب أحمد، والفريقان يحتجون بقصة حاطب. والصحيح: أن قتله راجع إلى رأي

الإمام، فإن رأى في قتله مصلحة للمسلمين، قتلـه، وإن كان استبقاؤه أصلح استبقاه. والله أعلم.[1]

ترجمہ:"اور اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جاسوس کو قتل کرنا جائز ہے اگر چہ مسلمان ہو، کیونکہ حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ سے حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے قتل کے متعلق پوچھا تھا،اور یہ امام مالکؒ کا مسلک ہے اور ایک قول امام احمدؒ سے بھی یہی منقول ہے، جبکہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے ہاں قتل کرنا جائز نہیں اور امام احمدؒ کا قول ظاہر بھی یہی ہے،اور دونوں فریق نے حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے واقعہ سے استدلال کیا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس کا دار و مدار امام کی رائے پر ہے اگر امام قتل کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت سمجھتا ہے تو قتل کر سکتا ہے اور زندہ چھوڑنا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے"۔

قدیم وجدید جاسوس میں فرق

حضرات فقہائے کرام کی ان تفصیلی عبارات سے جاسوس کا حکم اور اس میں حضرات اہلِ علم کا اختلاف رائے معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ جاسوسی کے مختلف مدارج اور متعدد مراتب ہیں ، بعض صورتوں میں کسی ایک جان یا کچھ مال کا نقصان ہوتا ہے جبکہ جاسوسی کی بعض نوعیتیں ایسی ہیں جو ملک وملت کے لئے سخت ضرر ونقصان کا پیش خیمہ ثابت ہو جاتی ہیں اور اس کا خسارہ صرف کسی چند افراد یا کچھ مال تک محدود نہیں رہتا بلکہ پورے ملک وملت کے لئے خطرے کا باعث بن جاتا ہے ، مثال کے طور پر موجودہ دنیا میں کسی ملک کے جوہری ایٹمی ہتھیار کے خلاف جاسوسی کرنے والے افراد اگر

---

[1] زاد المعاد في هدي خير العباد،فصل في الإشارة إلى ما في الغزوة من الفقه واللطائف،ج٣ص٣٧١.

کامیاب ہو جاتے ہیں اور ایٹمی طاقت کا سراغ لگا کر دشمن ملک کو اس کی ٹھیک ٹھیک معلومات مہیا کر لیتے ہیں تو اس سے ملک کو جو کچھ نقصان و خسارہ کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی طرح جاسوسی کی بعض صورتیں جنگ وجدال کی ظاہری شکلوں سے زیادہ مضر اور نقصان دہ ثابت ہو جاتی ہیں۔

اس لئے محض جاسوسی کا لفظ دیکھ کر تمام صورتوں کو یکساں قرار دینا قرین مصلحت نہیں معلوم ہوتا بلکہ جرم کی نوعیت اور اس سے واقع یا متوقع ہونے والے نقصان و خسارہ کا اندازہ لگا کر تعزیری سزا کا تعین کر لینا چاہئے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاصر دنیا میں جاسوسی کی بہت سی شکلیں ایسی بھی ہیں جو اپنے ہولناک نتائج و نقصانات کی وجہ سے "سعی بالفساد" کے ضمن میں داخل ہیں جہاں فقہائے احناف بلکہ دیگر بہت سے اہلِ علم کے نزدیک بھی حاکم کو سیاسۃً قتل کرنے کی گنجائش دی جاتی ہے۔"بحر" میں ہے:

وفي المجتبى الأصل في كل شخص إذا رأى مسلما يزني أن يحل له قتله وإنما يمتنع خوفا أن يقتله ولا يصدق في أنه زنى وعلى هذا القياس المكابرة بالظلم وقطاع الطريق وصاحب المكس وجميع الظلمة بأدنى شيء له قيمة وجميع الكبائر والأعونة والظلمة والسعاة فيباح قتل الكل ويثاب قاتلهم. اهـ.[1]

[1] البحر الرائق،فصل في التعزير،ج٥ص٤٥.

ترجمہ: "مجتبی" میں ہے: اس بارے میں اصل یہ ہے کہ جو شخص بھی کسی مسلمان کو زنا کرتا ہوا دیکھے تو زانی کا دیانۃ قتل حلال ہے لیکن اس وجہ سے قتل نہیں کریگا کہ یہ نہ ہو کہ قتل کے بعد کوئی مقتول کی زنا کرنے کی تصدیق نہ کرے (حالانکہ قاضی گواہان کے بعد ہی تصدیق کریگا) اور اسی پر قیاس کرتے ہوئے اس شخص کا حکم بھی ہے جو سرے عام ظلم کرے، ڈاکہ ڈالے، ناجائز ٹکس وصول کرے، اور ادنی سی قیمت والی چیز کے ساتھ بھی ظلم کرنے والا، اور کسی بھی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا، اور ان اشیاء پر مدد کرنے والا، ظالم، اور فساد پھلانے والا، ان تمام افراد کو دیانۃ قتل کرنا مباح ہے اور قاتل ثواب کا مستحق ہوگا"۔

"درمختار وشامی" میں ہے:

(وعلى هذا) القياس (المكابر بالظلم وقطاع الطريق وصاحب المكس وجميع الظلمة بأدنى شيء له قيمة) وجميع الكبائر والأعونة والسعاة يباح قتل الكل ويثاب قاتلهم انتهى.

وفي حاشية ابن عابدين تحته:

(قوله والأعونة) كأنه جمع معين أو عوان بمعناه، والمراد به الساعي إلى الحكام بالإفساد، فعطف السعاة عليه عطف تفسير. وفي رسالة أحكام السياسة عن جمع النسفي: سئل شيخ الإسلام عن قتل الأعونة والظلمة والسعاة في أيام الفترة: قال يباح قتلهم؛ لأنهم ساعون

في الأرض بالفساد، فقيل إنهم يمتنعون عن ذلك في أيام الفترة ويختفون. قال: ذلك امتناع ضرورة {ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه} كما نشاهد. قال وسألنا الشيخ أبا شجاع عنه، فقال: يباح قتله ويثاب قاتله. اهـ.١

ترجمہ: "جو سرے عام ظلم کرے، ڈاکہ ڈالے، ناجائز ٹکس وصول کرے، اور ادنی سی قیمت والی چیز کے ساتھ بھی ظلم کرنے والا، اور کسی بھی گناہ کبیرہ کاارتکاب کرنے والا، اور ان اشیاء پر مدد کرنے والا، ظالم، اور فساد پھلانے والا، ان تمام افراد کو دیانۃ قتل کرنا مباح ہے اور قاتل ثواب کا مستحق ہوگا۔ حضرت شیخ الاسلام سے ظلم وفساد اور ناجائز جاسوسی کرنے والوں کے متعلق پوچھا گیا کہ جب وہ لوگ اس نوعیت کے کام نہ کرتے ہوں توان کو قتل کرنا کیسا ہے؟ جواب دیا کہ مباح ہے کیونکہ وہ زمین میں ناحق فساد پھیلانے والے ہیں۔ پوچھا گیا کہ وہ تو چھٹی اور بے کاری کے دنوں میں ان کاموں سے رکتے ہیں اور چھد پتے ہیں (پھر قتل کرنا کیونکر مباح ہو سکتا ہے؟) جواب دیا کہ یہ مجبوری کار کنا ہے اور اگران کو دوبارہ موقع ملے تو وہی کریں گے جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے۔ اور ہم نے شیخ ابو شجاعؒ سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: ان تمام افراد کو دیانۃ قتل کرنا مباح ہے اور قاتل ثواب کا مستحق ہوگا"۔ "الأعو نۃ" معین یاعوان کی جمع ہے اور دونوں کاایک ہی معنی ہے، اور "ساعی" سے یہاں مراد یہ ہے جو حکومتی سطح پر فساد پیدا کرنے والا ہو، "ال سعاۃ" کااس پر عطف تفسیری ہوگا اور ا" حکام السیاسۃ" میں "جمع النسفی" کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

---

١ الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، باب التعزير، ج٤ ص٦٤.

چھٹی صورت: دشمنِ اسلام قوت کے ساتھ دینا

اسلام و کفر کی جنگ میں ضرورت اور استطاعت کے مطابق مسلمانوں کا ساتھ دینا ضروری ہے، ضرورت واستطاعت کے باوجود ایسے مواقع میں بر طرفی اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔اس بات کی تو شرعاً بالکل بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ایسے فیصلہ کن موقع پر بھی کوئی مسلمان کسی دشمنِ اسلام قوت کا ساتھ دیدے اور اس کی صف میں شامل ہو جائے، مسلمانوں سے بر سرِ پیکار قوت کے ساتھ وابستگی چاہے دنیوی حرص ولالچ کی بناء پر ہو، مال وجاہ کی ہوس وہاں تک لے پہنچائے یا کسی کی بزدلی اور بے غیرتی وہاں تک لے جانے کا متقاضی ہو، بہر صورت کسی مسلمان کے لئے ایسا اقدام کرنا شرعاً حرام اور سخت گناہ کبیرہ ہے۔قرآن وحدیث میں اس کی خوب خوب مذمت کی گئی ہے اور عقلی و منطقی طور پر بھی اس کی برائی وشناعت محتاجِ بیان نہیں ہے۔ایسا اقدام کرنا بھی ان اسباب ووجوہات میں سے ایک ہے جس کے ارتکاب کرنے کی وجہ سے کسی مسلمان کا خون معصوم نہیں رہتا، بلکہ مسلمان فوج کے لئے اس بات کی پوری اجازت ہے کہ اگر مخالف صف میں کھڑے مسلمان کو قتل کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو قتل کرے۔

فقہائے کرام نے تو یہاں تک تحریر فرمایا ہے کہ اگر کوئی کافر فوج کمزور مسلمانوں کو ان کی مرضی کے بغیر زبردستی اپنی صف میں لا کھڑا کردے اور نیزہ مارتے وقت وہ انہی مسلمانوں کو بطور ڈھال استعمال کریں تو بھی مجبوری کے وقت مسلمان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ نیزہ مارنے سے رک جائے بلکہ کوئی اور تدبیر مفید ثابت نہ ہو تو وار نیزہ ماریں ،اس سے اگر مجبور ولاچار مسلمان کی جان ضائع بھی ہو جائے تو بھی مارنے والے مسلمان پر کوئی گناہ نہیں ہوگا بلکہ جہاد کا عظیم ثواب ملے گا ،تاہم چونکہ صف مقابل میں موجود

مسلمانوں کو اپنی مرضی واختیار کے بغیر کھڑ کر دیا گیا ہے اس لئے مارتے وقت ان کو مارنے کی نیت نہ کریں بلکہ کفر و کفار کی شان شوکت کو ملیا میٹ کرنے کا قصد کریں۔

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قلت: فإن حاصر المسلمون مدينة فقام العدو على سورها ومعهم أطفال من أطفال المسلمين يتترّسون بهم أيحل للمسلمين أن يرموهم بالنَّبْل والمنجنيق؟ قال: نعم، ولكن ليتعمدوا به أهل الحرب ولا يتعمدوا به أطفال المسلمين. قلت: ويحل للمسلمين أن يضربوهم بالسيوف ويطعنوهم بالرماح ولا يتعمدوا بذلك الأطفال؟ قال: نعم. قلت: فما أصاب المسلمون في رميهم بالمنجنيق ورميهم بالنَّبْل وإرسالهم الماء وتحريقهم بالنار من أطفال المسلمين أو رجل من المسلمين أو امرأة من أهل الحرب أو صبي أو شيخ كبير من أهل الحرب أو أعمى أو مقعد أو معتوه هل عليهم في شيء من ذلك دية أو كفارة؟ قال: ليس عليهم في ذلك دية ولا كفارة.[1]

ترجمہ:" اگر مسلمان کسی شہر کا محاصرہ کرلے اور دشمن شہر کی چار دیوار پر مسلمانوں کے بچوں کو ڈھال بناکر کھڑے ہو جائیں تو کیا مسلمان کے لئے ان

---

[1] الأصل للشيباني،كتاب السير، باب من يُقْتَل من أهل الحرب إذا سُبُوا وما يُخرَق ويُخَرَّب من حصونهم،ج٧ص ٤٥٥.

کفار کو تیر اور منجنیق سے نشانہ بنانا درست ہے؟جواب میں فرمایادرست ہے لیکن اس میں صرف کفار کی نیت کی جائے مسلمانوں کے بچوں کی نیت نہ کی جائے،عرض کیا مسلمانوں کے لئے حلال ہے کہ ان کو تلوار یا نیزہ سے نشانہ بنائے اور مسلمانوں کے بچوں کی نیت نہ کی جائے، فرمایا جی ہاں جائز ہے۔عرض کیا کہ کفار کو تیر اور منجنیق سے نشانہ بناتے وقت،یاپانی چھوڑتے ہوئے یاآگ سے جلاتے وقت اگر مسلمانوں کے بچے یا مسلمان مرد،حربی عورت،،بچہ،حربی بوڑھا،نابینا،اپاہج،معتوہ،لگ جائے تو کیا اس صورت میں مسلمانوں پر دیت یا کفارہ ہے؟ فرمایادیت یا کفارہ نہیں"۔

"تحفۃالفقہاء"میں ہے:

وكـذا إذا تترسـوا بأطفـال المسـلمين وبأسـاراهم لكـن ينبغي أن يقصدوا به قتل الكفار دون المسلمين لما فيه من ضرورة إقامة الفرض عليهم.[1]

ترجمہ:"جب کفار مسلمانوں کے بچوں یا مسلمان قیدوں کوڈھال بناکر کھڑے ہو جائیں تو مسلمان کفار کو نشانہ بنا سکتے ہیں ہے لیکن صرف کفار کی نیت کی جائے مسلمانوں کی نیت نہ کی جائے،کیونکہ اس میں فرض کو پورا کرنے کی ضرورت ہے"۔

"فتاویٰ کاملیہ"میں ہے:

---

[1] تحفة الفقهاء،كتاب السير،ج٣ص٢٩٥.

سئلت عن بلـدة اسـتولى عليهـا الكفّـار وتمكّنـوا منهـا فانضمّ إليهم بعض القبائل والعشائر وصـاروا يقـاتلون معهـم المسـلمين وينهبـون مـالهم وينصـحون الكفّـار ويعينونهم على أذي المسـلمين فكـانوا اشـدّ ضررا عـلى المسلمين من الكفّار، فما الحكم فيهم وهذا حالهم؟

فالجواب: أنّي لم أقفْ على حكم هولاء في كتـب مـذهبنا معاشر الحنفية ولكنْ وقفتُ على حكمهم في كتب بعض السادات المالكية. قال في فتح الثغـر الـوهراني لمـاّ دعـى النّاسَ سلطان الجزائر إلى جهاد الكفـار الـذين اسـتولوا على الثغر الوهران جاؤوا إليه مِن كلّ فجّ عميق، وكـان هذا حال غير القبائل العامرية، أمّا بنو عامر فإنّهم كـانوا في ذلك على فرق، منهم مَن لجأ لحصون العدوّ ومـدافعا عن نفسه ومعينا للعدوّ بسيفه وفلسه فكـانوا يقـاتلون المسلمين مع عدوّهم ويدفعون عنه ويغزون على الحجلة المنصورة بالله تعالى حتّى كانوا على المسلمين اشـدّ ضررا من الكافرين وهكذا كان بعـض القبائـل. والظّـاهر أنّ حكم هولاء حكم اهل دار الحرب في قتلهم وأخذ مالهم وأمّا أولادهم فلا يُقتلون ولا يكونون فيئـا وإنّـما أبـيح قتل البالغين لكـونهم ردأ لأهـل الحـرب ومعينـين لهـم

بأنفسهم وحكـمُ الـردء إذا لمْ يقاتـلْ مـع العـدوّ حكـم المقاتل فأحرى إذا قاتل... فليحفظْ فإنّـه مهـمّ وقواعـد مذهبنا لا تأباه.[1]

ترجمہ: "مجھ سے ایسے شہر کے بارے میں پوچھا گیا جس پر کفار غالب آجائے اور وہاں قبضہ جمالے اور اس کے ساتھ بعض قبائل اور خاندان مل کر مسلمانوں کے خلاف قتال میں شریک ہونے لگے اور مسلمانوں کا مال لوٹنے کے ساتھ ساتھ کفار کے ساتھ ہمدردی بھی کرنے لگے، اور مسلمانوں کو تکلیف دینے میں کفار کی مدد کرے، مسلمانوں کو تکلیف دینے میں کفار سے بھی سخت ہو تو ان کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: ہمارے احناف کی کتب میں اس کے متعلق مجھے کوئی عبارت نہیں ملی لیکن مالکیہ کی بعض کتب میں اس کا حکم میں نے دیکھا ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ ان کا حکم قتل کرنے اور مال لینے میں حربیوں کی طرح ہے، اور ان کے اولاد کو قتل نہیں کیا جائے گا اور غنیمت بھی شمار نہیں کیا جائے گا، اور بالغ افراد کو اس لئے قتل کیا جائے گا کہ انہوں نے اپنی جان سے اہل حرب کی دفاع اور مدد کی ہے، اور جو دفاع کرے تو ان کا حکم قتال والوں کی طرح ہے تو جب قتال میں شریک ہو تو بطریق اولی یہ حکم ہو گا، اس مسئلہ کو اہم ہونے کی وجہ سے یاد رکھا جائے"۔

مولانا نور محمد صاحب کی تحقیق

[1] كتاب الجنايات، ص ٢٥٠.

ماضی قریب میں کچھ لوگوں نے کچھ دنیوی مفادات کی خاطر مسلمانوں کے خلاف روسی اور افغانی افواج کا ساتھ دیا تھا،ان لوگوں کے متعلق ایک سوال کے جواب میں مولانا نور محمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ان لوگوں کو اگرچہ کافر اور مرتد تو نہیں کہا جاسکتا ہے، مگر ان کے مبینہ طور پر تین جرائم ہیں:

ا: مجاہدین کے خلاف لڑنے والے روسی اور نجیبی فوج کی اعانت کرنا، ان کے پاؤں جمانا، ان کے حوصلے بلند کرنا اور روسی قبضہ کو دوام دینا۔

۲: افغان مجاہدین کو روسی اور نجیبی فوجوں سے بطریق مخبری قتل کروانا اور ایذاء پہنچانا۔

۳: افغان مجاہدین پر جہاد کے لئے آنے جانے کے راستے بند کرنا، ان پر ڈاکے ڈالنا، ان کے خلاف راہ زنی کا ارتکاب کرنا۔ ان تین مبینہ جرائم کے پیش نظر ایسے لوگوں کو قتل کرنا، انہیں اپاہج کروانا، ان کی کمین گاہوں کو تباہ کرنا از روئے شریعت اسلامی، حکومت وقت پر فرض ہے اور عام لوگوں کے لئے ایسا کرنا باعث ثواب ہے۔"[1]

ضروری تنبیہ

واضح رہے کہ یہاں صرف قتل و قتال کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ کفار کی صف میں اگر مسلمان کھڑے ہوں اور کفار کی طرف سے مسلمان کے خلاف جنگ کرتے ہوں تو ایسے لوگوں کے ساتھ قتال کرنا بھی جائز ہے اور ضرورت ہو تو قتل کرنا بھی مباح ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ کیا اس اقدام کی وجہ سے یہ لوگ کافر یا مرتد بھی ہو جائیں گے یا نہیں؟ بالفاظِ دیگر: کیا ایسا اقدام کرنا موجبِ کفر بھی ہے یا نہیں؟ یہ الگ مسئلہ میں ہے جو اس رسالہ

---

[1] جہاد افغانستان، ص65

کا موضوع نہیں ہے اس کے لئے فقہی کتابوں کی طرف مراجعت کر لینی چاہئے۔ کسی مسلمان کے محض خون مباح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ضرور کافر بھی ہو جائے بلکہ کئی جرائم ایسے بھی ہیں جن کی وجہ سے مسلمان کو قتل کرنا جائز یا واجب بن جاتا ہے لیکن محض اس کی بنیاد پر اس کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ساتویں صورت: مفسد و علانیہ ظالم کو قتل کرنا

کوئی شخص معاشرے میں کھلم کھلا ظلم و فساد مچا رہا ہو، کھلِ عام لوگوں کا مال ہڑپ کر رہا ہو، علانیہ بد دینی کا مظاہرہ کر رہا ہو یا دین کے ضروری اور قطعی نوعیت کے مسائل کا انکار کر کے لوگوں کی گمراہی کا باعث بن رہا ہو یا اس جیسے کسی اور جرم میں مبتلا ہو جو دینی اور دنیوی لحاظ سے لوگوں کے لئے غیر معمولی نقصان پہنچنے کا باعث ہو، ایسے افراد کو ان جیسے غلط کاریوں سے بچائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر لینی چاہئے، حکمت و مصلحت کے مطابق نرمی و محبت یا سختی و دھمکی وغیرہ سے اس کو ان جیسے اعمالِ بد سے باز رکھنے کی بھرپور سعی کر لینی چاہئے، اگر کہیں کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہو تو ایسے حالات میں واقعی اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ ایسے شخص کو قتل کر کے امت کو اس کے شر سے محفوظ رکھے۔

"بحر" میں ہے:

وعلى هذا القياس المكابرة بالظلم وقطاع الطريق وصاحب المكس وجميع الظلمة بأدنى شيء له قيمة وجميع الكبائر والأعونة والظلمة والسعاة فيباح قتل الكل ويثاب قاتلهم. اهـ.

ترجمہ: " جو سرے عام ظلم کرے، ڈاکہ ڈالے، ناجائز ٹکس وصول کرے، اور ادنی سی قیمت والی چیز کے ساتھ بھی ظلم کرنے والا، اور کسی بھی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا، اور ان اشیاء پر مدد کرنے والا، ظالم، اور فساد پھیلانے والا، ان تمام افراد کو دیانۃ قتل کرنا مباح ہے اور قاتل ثواب کا مستحق ہو گا"۔

اس عبارت میں صراحت ہے کہ ان جیسے افراد کو قتل کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ (درست نیت کے ساتھ ہو تو) موجبِ ثواب بھی ہے، تاہم قتل کا یہ اقدام کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ اصلاً یہ ذمہ داری حکومت ہی کی ہے کہ وہ معاشرے پر نظر رکھے اور ان جیسے افراد کو راہِ راست پر لائے ورنہ تو قتل کردے، چنانچہ "بحر" میں اس کے متصل بعد لکھا ہے:

ولم يذكر المصنف من يقيمه قالوا لكل مسلم إقامته حال مباشرة المعصية، وأما بعد الفراغ منها فليس ذلك لغير الحاكم قال في القنية رأى غيره على فاحشة موجبة للتعزير فعزره بغير إذن المحتسب فللمحتسب أن يعزر المعزر إن عزره بعد الفراغ منها قال - رضي الله عنه - قوله: إن عزره بعد الفراغ منها فيه إشارة إلى أنه لو عزره حال كونه مشغولا بالفاحشة فله ذلك وأنه حسن؛ لأن ذلك نهي عن المنكر وكل واحد مأمور به وبعد الفراغ

ليس بنهي عن المنكر؛ لأن النهي عما مضى- لا يتصور فيتمخض تعزيرا وذلك إلى الإمام. اهـ.[1]

ترجمہ: "مصنفؒ نے اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ تعزیر کو کون قائم کریگالیکن دیگر فقہاء فرماتے ہیں کہ معصیت کے ارتکاب کے دوران اگر کوئی پکڑا جائے تو تعزیر جاری کرنے کا حق عام مسلمان کو بھی ہے، اور معصیت سے فراغت کے بعد اگر پکڑا گیا تو صرف حاکم کو اختیار ہے "قنیہ" نامی کتاب میں ہے کہ اگر کسی نے کسی کو ایسی معصیت کے ارتکاب کے دوران دیکھا جو موجب تعزیر ہو اور اس کو نگران کی اجازت کے بغیر تعزیر دی اور معصیت سے فراغت کے بعد تعزیری سزا دی ہو تو نگران اس شخص کو تعزیر دے سکتا ہے، مصنفؒ اس قول "إن عزره بعد الفراغ منها" میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر معصیت کے ارتکاب کے دوران اگر کوئی پکڑا جائے تو تعزیر جاری کرنے کا حق عام مسلمان کو بھی ہے بلکہ احسن ہے کہ یہ نہی المنکر میں داخل ہے اور ہر ایک مسلمان اس کا مکلف ہے، اور معصیت سے فراغت کے بعد یہ نہی نہیں، کیونکہ گزشتہ کام میں نہی کا تصور نہیں کیا جاسکتا تو یہ محض تعزیر ہو گی جو کہ امام وقت کا کام ہے"۔

"در مختار" اور "شامی" میں یہ مسئلہ مزید تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ "در مختار" میں ہے:

---

[1] البحر الرائق شرح كنز الدقائق ومنحة الخالق وتكملة الطوري (٥/ ٤٥)

(وعلى هذا) القياس (المكابر بالظلم وقطاع الطريق وصاحب المكس وجميع الظلمة بأدنى شيء له قيمة) وجميع الكبائر والأعونة والسعاة يباح قتل الكل ويثاب قاتلهم انتهى. وأفتى الناصحي بوجوب قتل كل مؤذ (قوله وقطاع الطريق) أي إذا كان مسافرا ورأى قاطع طريق له قتله وإن لم يقطع عليه بل على غيره، لما فيه من تخليص الناس من شره وأذاه كما يفيده ما بعده (قوله وجميع الكبائر) أي أهلها. والظاهر أن المراد بها المتعدي ضررها إلى الغير.. فيشمل كل من كان من أهل الفساد كالساحر وقاطع الطريق واللص واللوطي والخناق ونحوهم ممن عم ضرره ولا ينزجر بغير القتل (قوله والأعونة).

ترجمہ:" جو سرے عام ظلم کرے،ڈاکہ ڈالے،ناجائز ٹکس وصول کرے،اور ادنی سی قیمت والی چیز کے ساتھ بھی ظلم کرنے والا،اور کسی بھی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا،اور ان اشیاء پر مدد کرنے والا،ظالم،اور فساد پھلانے والا،ان تمام افراد کو دیانۃ قتل کرنا مباح ہے اور قاتل ثواب کا مستحق ہوگا،اور ناصحیؒ نے ہر موذی شخص کے قتل کا فتوی دیا ہے،اور مصنفؒ کے قول" وقطاع الطریق "کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسافر ڈاکہ ڈالنے والے کو دیکھ لے تو اس کے لئے قتل کرنا جائز ہے اگرچہ کسی اور پر ڈاکہ ڈالے کیونکہ اس میں لوگوں کو اس کے شر اور

تکلیف سے بچانا ہے جیسا کہ بعد والی عبارت سے معلوم ہوتا ہے، اور مصنفؒ کے قول" وجمیع الکبائر "سے مراد گناہ کبیرہ کے ارتکاب کرنے والے ہیں،اور مراد وہ معصیت ہے جس کا ضرر متعدی ہو،لہذا یہ حکم ہر فساد پیدا کرنے والا کو شامل ہے جیسے: جادو گر، ڈاکہ ڈالنے والا،چور،لواطت کرنے والا،گلا گھونٹنے والا،اور ان جیسے وہ لوگ جن کا ضرر عام ہو اور قتل کے بغیر تنبیہ نہ ہوتی ہو"۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

سئل شيخ الإسلام عن قتل الأعونة والظلمة والسعاة في أيام الفترة: قال يباح قتلهم؛ لأنهم ساعون في الأرض بالفساد، فقيل إنهم يمتنعون عن ذلك في أيام الفترة ويختفون. قال: ذلك امتناع ضرورة - {ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه} كما نشاهد. قال وسألنا الشيخ أبا شجاع عنه، فقال: يباح قتله ويثاب قاتله. اهـ. (قوله وأفتى الناصحي إلخ) لعل الوجوب بالنظر للإمام ونوابه والإباحة بالنظر لغيرهم ط[1]

ترجمہ:"حضرت شیخ الاسلام سے ظلم وفساد اور ناجائز جاسوسی کرنے والوں کے متعلق پوچھا گیا کہ اسے فراغت کے اوقات میں قتل کرنا کیسا ہے؟ جواب دیا کہ مباح ہے کیونکہ وہ زمین میں ناحق فساد

---

[1] الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (٤/ ٦٤)

پھیلانے والے ہیں۔ پوچھا گیا کہ وہ تو چھٹی اور بے کاری کے دنوں میں ان کاموں سے رکتے ہیں اور چھپتے ہیں (پھر قتل کرنا کیونکر مباح ہو سکتا ہے ؟) جواب دیا کہ یہ مجبوری کا رکنا ہے اور اگر ان کو دوبارہ موقع ملے تو وہی کریں گے جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے۔ اور ہم نے شیخ ابو شجاعؒ سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: ان تمام افراد کو دیانۃ قتل کرنا مباح ہے اور قاتل ثواب کا مستحق ہو گا، ان دونوں اقوال میں تطبیق اس طرح ہو سکتا ہے کہ وجوب کا حکم امام کے لئے ہے اور اباحت کا حکم عام افراد کے حق میں ہے"۔

ان دونوں عبارات سے معلوم ہوا کہ :

الف: درج بالا عنوان کے تحت جن افراد کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا قتل کرنا نہ صرف جائز یا موجبِ ثواب بلکہ بعض فقہائے کرام کے نزدیک واجب ہے (جب کہ اس کی استطاعت ہو)۔

ب: علامہ طحطاوی رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک ارباب اقتدار کے لئے تو ایسے افراد کا قتل کرنا واجب ہے لیکن عام افراد کے لئے مباح ہے، واجب نہیں ہے۔

آٹھویں صورت: فدائی حملہ کرنے کا شرعی حکم

فدائی حملے سے دشمن پر ایسا وار کرنا مقصود ہے جس میں جان جانا یقینی یا یقین کے قریب ہو، اس کو خود کش دھماکہ کرنے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسا حملہ انسان کیوں کرے؟ کس پر کرے؟ اور کیسے کرے؟ ان جیسے عناصر کی بناء پر اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور سب کا حکم بھی یکساں نہیں ہے، اس لئے سب کا ایک حکم میں جمع کرنا مشکل ہے۔ اجمالی طور پر اتنی بات کافی ہے کہ :

الف: حملہ آور شخص کا مقصود کوئی مطلوبِ شرعی ہو، ناجائز ہدف کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے، مثال کے طور پر کسی معصوم شخص یا اشخاص کو قتل کرنا، زندگی سے تنگ آکر مرنے کو ترجیح دینا۔

ب: خودکشی سے کم درجے کی کوئی کاروائی میسر وکارگر ہو، فدائی حملے میں مرنا یقینی ہے، اگر کسی دوسرے راستے سے مقصود حاصل کرنا ممکن ہو اور اس میں جان جانا اس قدر یقینی نہ ہو تو اسی کو اختیار کرلیا جائے۔

ج: اس کے نتیجے میں کسی ایسے غیر مشروع یا ناجائز کام پیدا ہونے کا اندیشہ غالب ہو جو اس بنیادی ہدف سے بڑھ کر شناعت وقباحت کا حامل ہو جس کے لئے ایسا حملہ کیا جاتا ہو۔

ان شرائط کا لحاظ رکھا جائے تو جائز اور بعض صورتوں میں واجب ہے اور نہ ہو تو ناجائز اور خودکشی کے مترادف ہے۔

علامہ قاضی ابوزید دبوسی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ومثال ذلك أمر الله تعالى بقتال الكفار لإعلاء كلمة الله، وإذلال الشرك ونحن لا ندري إصابة النصرة إلا بغالب الرأي فمن قاتل على تحري إصابة النصر كان مصيباً في قتاله متمثلاً بأمر الله تعالى قتل أم قتل، وكان مستحقاً للأجر العظيم لأنه مصيب لما قاتل على تحري إصابة النصرة أصاب أم لم يصب حتى لو تيقن بأنه يقتل لا

محالة من غير أن ينكأ نكاية وقصد بالقتال أن يقتل لا غير كان آثماً.[1]

ترجمہ: "اوراس کی مثال اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اور شرک کو ذلیل کرنے کے لئے کفار کو قتل کرنے کا اللہ تعالی کا حکم ہے،اور ہم دین کی نصرت تک صرف غالب گمان ہی کے ذریعہ پہنچ سکتے ہیں، لہذا جو شخص نصرت کی امید پر قتال کرے تو اس قتال میں راہ راست پر ہوگا اور اللہ تعالی کے حکم کی تعمیل کرنے والا ہوگا چاہے دشمن کو قتل کرے یا خود شہید ہو جائے،اور وہ ثواب کا مستحق ہوگا کیونکہ اس نے نصرت کی امید پر قتال کیا ہے اب حقیت میں نصرت ہو یا نہ ہو، یہاں تک کہ اگر کسی کو یقین ہو کہ دشمن کو نقصان پہنچائے بغیر خود قتل ہی ہو جائے گا اور اس کا مقصد بھی اپنا ہی قتل ہونا ہو تو اس صورت میں یہ گنہگار ہوگا"۔

شیخ عبدالقادر عودہ شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

تحرم الشريعة على الإنسان أن يصيب نفسه بأذى عمداً أو خطأ؛ فليس له أن يجرح نفسه أو يقطع طرفه أو غير ذلك، فإن فعل عوقب على ذلك بعقوبة تعزيرية، وإذا كان من المحرم أن يصيب الإنسان نفسه، فإن من المحرم على غيره أن يشترك معه في تلك الجريمة.[2]

---

[1] تقويم الأدلة في أصول الفقه (ص: ٤١٢)

[2] التشريع الجنائي الإسلامي مقارنا بالقانون الوضعي (١/ ٤٤٧)

ترجمہ: "شریعت نے انسان پر اپنے آپ کو خود قصدا یا بے احتیاطی میں تکلیف دینے کو حرام کردیا ہے، لہذا کسی کے لئے اپنے نفس کو زخمی کرنا، اپنا عضو کاٹنا، یا اس کے علاوہ اور کوئی صورت اختیار کرنا درست نہیں، اگر کسی نے ان صورتوں میں سے کوئی اختیار کی تو سخت تعزیری سزادی جائے گی، جب انسان پر خود یہ حرام ہے، تو دوسرے کے ساتھ اس جرم میں شریک ہونا بھی حرام ہے"۔

امام محمدؒ کی ذکر کردہ تفصیل

امام سرخسی رحمہ اللہ نے "شرح سیر کبیر" میں اس موضوع پر کچھ تفصیلی بحث ذکر فرمائی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ:

الف: اگر کوئی شخص اکیلے طور پر کافر لشکر پر حملہ کرے اور امید ہو کہ ان کو شکست دیدے گا یا ان کی جمعیت کمزور ہوجائے گی ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ یہ جائز ہے، حضور ﷺ کے سامنے کئی صحابہ کرام نے ایسا کیا اور آپ ﷺ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ بعض کو خوشخبری بھی عطاء فرمائی۔

ب: اگر سمجھتا ہو کہ میرے حملہ سے دشمن کو کوئی (خاطر خواہ) نقصان نہیں پہنچے گا تو اس صورت میں ایسا کرنا مکروہ وممنوع ہے، البتہ یہ تب ہے کہ دشمن کافر ہو۔ اگر مسلمانوں کی کسی گروہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت پیش آجائے تو وہاں اس کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے۔

ج: سمجھتا ہو کہ دشمن نہ شکست کھائے گا اور نہ ہی کوئی خاص نقصان اٹھائے گا لیکن اس اقدام سے مسلمانوں کے اندر جوش وولولہ پیدا ہو گا اور وہ بلند ہمتی کے ساتھ جہاد کرنا شروع کریں گے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ یہ بھی جائز ہے۔

"شرح سیر کبیر" میں ہے:

ولو أن مسلما حمل على ألف رجل وحده فإن كان يطمع أن يظفر بهم أو ينكأ فيهم فلا بأس بذلك. لأنه يقصد بفعله النيل من العدو. وقد فعل ذلك بين يدي رسول الله – صلى الله عليه وآله وسلم –، غير واحد من الأصحاب يوم أحد ولم ينكر ذلك عليهم رسول الله – صلى الله عليه وآله وسلم –، وبشر بعضهم بالشهادة حين استأذنه في ذلك، وإن كان لم يطمع في نكاية فإنه يكره له هذا الصنيع. لأنه يتلف نفسه من غير منفعة للمسلمين، ولا نكاية فيه للمشركين. وفي الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر يسعه الإقدام، وإن كان يعلم أن القوم يقتلونه وأنه لا يتفرق جمعهم بسببه؛ لأن القوم هناك مسلمون معتقدون لما يأمرهم به، فلا بد من أن فعله ينكي في قلوبهم، وإن كانوا لا يظهرون ذلك، وها هنا القوم كفار لا يعتقدون حقيقة الإسلام وفعله لا ينكي في باطنهم، فيشترط النكاية ظاهرا لإباحة الإقدام.

وإن كان لا يطمع في نكاية ولكنه يجرئ بذلك المسلمين عليهم حتى يظهر بفعله النكاية في العدو فلا بأس بذلك، إن شاء الله تعالى. لأنه لو كان على طمع من النكاية بفعله جاز له الإقدام، فكذلك إذا كان يطمع في النكاية فيهم بفعل غيره. وكذلك إن كان في إرهاب العدو وإدخال الوهن عليهم بفعله فلا بأس به؛ لأن هذا أفضل وجوه النكاية، وفيه منفعة للمسلمين وكل واحد يبذل نفسه لهذا النوع من المنفعة.[1]

ترجمہ:" اگر ایک مسلمان ایک ہزار (۱۰۰۰) کفار پر اکیلا حملہ کرنا چاہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کو امید ہو کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جائے گا یا اس حملے کی وجہ سے کفار کمزور ہو جائنگے تو اس حملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس کا مقصد دشمن کے خلاف کامیابی ہے، اور آپ ﷺ کی موجودگی میں کئی صحابہ کرامؓ نے احد کے دن ایسا کیا تھا، اور آپ ﷺ نے ان پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ بعض کو اجازت کے وقت شہادت کی خوشخبری بھی دی۔ اور اگر اس فعل کی وجہ سے دشمن کی کمزوری کی امید نہ ہو تو یہ فعل مکروہ ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے بغیر اپنے نفس کو ضائع کر رہا ہے، اور اس میں کفار کی کمزوری بھی نہیں، اور امر بالمعروف اور نہی عن

---

[1] شرح السير الكبير، باب ما يسع الرجل أن يفعله في دار الحرب إذا أهوى إلى الهلاك (ص: ١٥١٢)

المنکر میں اس کی گنجائش ہے اگرچہ وہ یہ جانتا ہو کہ لوگ اس کو قتل کر دینگے، اور اس کی وجہ سے ان کی قوت پر فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ یہاں لوگ مسلمان ہے اور جس چیز کا ان کو حکم دیا جارہا ہے اس پر وہ اعتقاد رکھتے ہیں لہذا اس فعل کی وجہ سے ان کے دلوں میں رعب پیدا ہو گا اگرچہ وہ اس ظاہر نہیں کرینگے، اور پہلی صورت میں کفار جو اسلام کی حقانیت کا اعتقاد نہیں رکھتے تو اس صورت میں اس کے فعل سے کفار کے دل مرعوب نہیں ہونگے تو اقدام کے مباح ہونے کے لئے ظاہری کمزوری کا اعتبار کیا گیا، اگرچہ ابتداء کفار کی کمزوری کی امید نہ ہو لیکن اس کی وجہ سے مسلمانوں کو جرت حاصل ہو گی جس کے نتیجے میں دشمن کمزور ہو جائے تو تب بھی حملہ درست ہے کیونکہ جب اس کے فعل سے دشمن کے کمزور ہونے کا امکان ہو تو اقدام جائز ہے تو جب غیر کے فعل کے نتیجے میں ہو تو تب بھی جائز ہے، اور اسی طرح حملہ جائز ہے جب دشمن کے بھاگنے اور مرعوب ہونے کی امید ہو، کیونکہ یہ بھی شکست کی وجوہات میں سے اہم وجہ ہے اور اس میں مسلمانوں کا اجتماعی فائدہ ہے جس کے لئے ہر کوئی جان دینے کے لئے تیار ہے"۔

مصادر و مراجع

- آپ کے مسائل اور ان کا حل
- احسن الفتاوی
- الاختیار لتعلیل المختار
- الأصل للشیباني
- الإعلام بفوائد عمدة الأحكام
- الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف
- البحر الرائق
- تبصرة الحكام في أصول الأقضية و مناهج الأحكام
- تبيين الحقائق
- تحفة الفقهاء
- التشريع الجنائي الإسلامي مقارنا بالقانون الوضعي
- تفسير القرطبي.
- تقويم الأدلة في أصول الفقه
- جامع العلوم والحكم
- جہاد افغانستان
- الخراج لأبي يوسف
- الدر المختار مع حاشية ابن عابدين
- زاد المعاد في هدي خير العباد
- سنن أبي داود ت الأرنؤوط
- سنن النسائي

- شرح السير الكبير
- شرح النووي على مسلم
- صحيح البخاري
- صحيح مسلم
- طبقات الشافعية الكبرى للسبكي
- فتاوی قاضیخان،
- فتاویٰ کاملیہ
- فتح الباري
- فتح باب العناية بشرح النقاية
- فيض الباري
- قواعد الفقہ
- المبسوط للسرخسي
- المحيط البرهاني في الفقه النعماني
- منحة الخالق على البحر الرائق
- النوادر والزيادات على ما في المدونة من غيرها من الأمهات
- الهداية في شرح بداية المبتدي